

نگہت سیما

ماء الملوك

مکمل ناول

NOVELS LAND



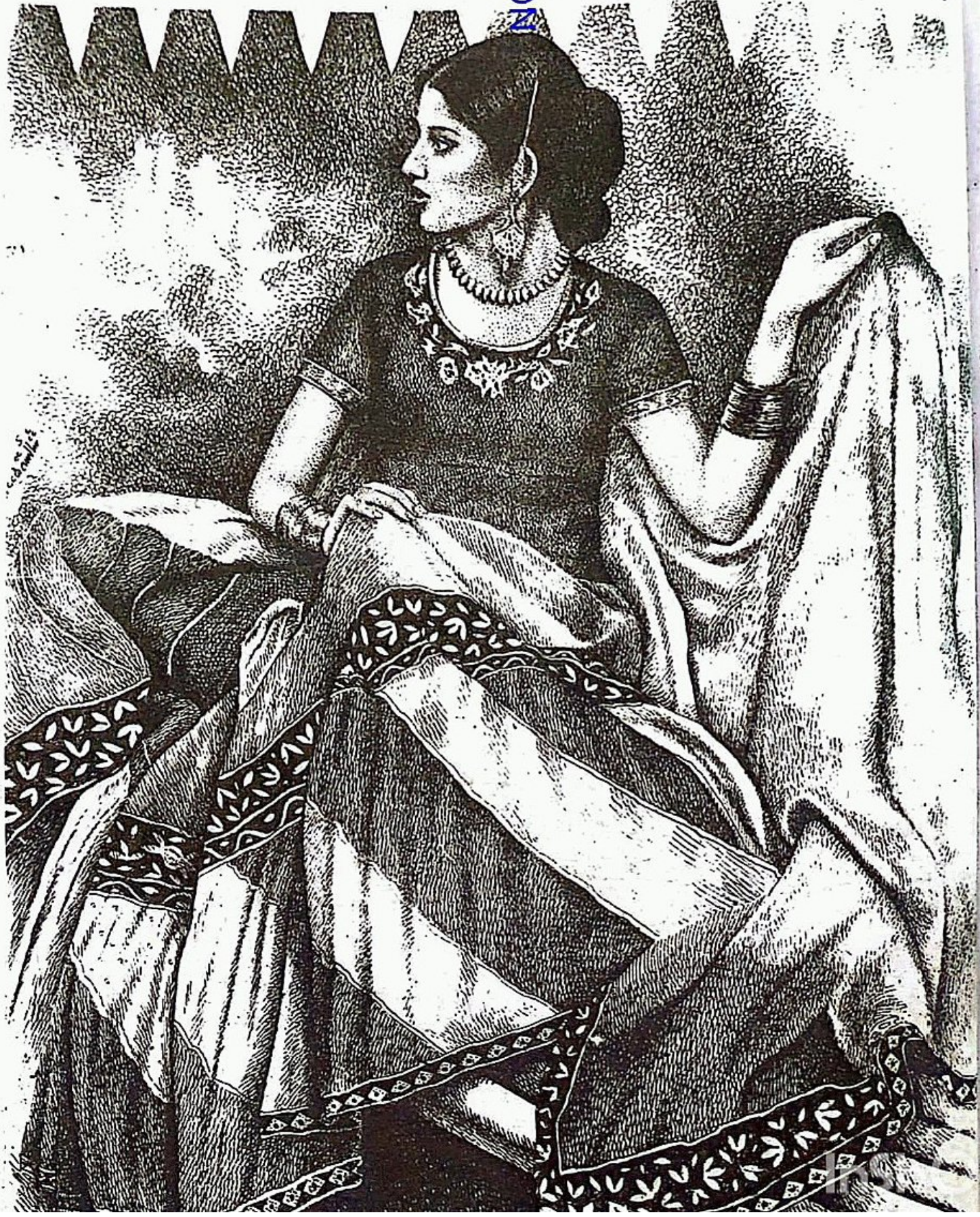
لاہور کے ذلی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ مرزا جہاں زیب اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اوپر والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گرانڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شازیب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔ اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ ظفریاب کا ایک بیٹا آرزین تھا اور شاہ زیب بیگ کی ایک بیٹی زمل تھی آرزین اور زمل کا نکاح ہو چکا تھا۔ شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفریاب کی کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا، نہ جانے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔ ظفریاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

چھٹی قسط



اس نے جلد کنویں کے پاس گھرے رکھنے کے لیے جو جگہ ہوتی ہے (پر رکھے گھرے کو ٹھیک کر کے رکھا اور ہاتھ میں پکڑے ڈول میں سے اس میں پانی ڈالنے لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے گھوڑے کی ہڈیوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

پگڈنڈی پر دھول اڑ رہی تھی۔ گھوڑے کے سموں سے اڑنے والی مٹی کے بادلوں سے وہ نمودار ہوا۔ سفید گھوڑے پر سوار کوئی ادھر ہی آ رہا تھا، وہ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگی۔ پانی سے بھرا ڈول اس نے نیچے رکھ دیا تھا۔ کنویں سے کچھ دور سوار نے گھوڑے کی باگیں



”شہزادہ سلیم بہت دور سے تمہیں ہی کھوجتا ہوا
 ”آیا ہوں۔“ urdushehar.com
 ”مجھے“ وہ حیران ہوئی۔
 ”ہاں تمہیں میری شہزادی۔ میرے ساتھ
 چلو گی۔“

”کہاں“ اس نے پوچھا۔
 ”جہاں بھی لے چلوں۔“ وہ سنے پر ہاتھ رکھ کر
 جھکا تو اس کی پکڑی میں لگے قیمتی نگینے کی چمک ڈول
 میں پڑے پانی پر پڑی۔
 ”اور اگر میں نہ جاؤں تو۔“ آنکھوں میں شرارت
 تھی اور لبوں کے گوشے میں مدہم سی مسکراہٹ۔
 ”تو“ اجنبی نے کنویں میں جھانکا۔
 ”میری تلاش تو ختم ہو گئی ہے میری شہزادی! میں
 زندگی کا سفر بھی یہاں ہی تمام کر دوں گا۔“ وہ کنویں کی
 طرف بڑھا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔
 ”نہیں۔“ اس نے مڑ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو
 اس نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا
 ، اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گھوڑے کی
 طرف بڑھا۔ اور اسے گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد کی۔
 ماسٹر عبدالعزیز کہتے تھے میری بیٹی کے لیے تو
 کوئی شہزادہ ہی آئے گا۔

”تو کیا یہ وہ ہی شہزادہ ہے۔“ اس نے جگد پر
 بڑے گھرے گوار اس کے پاس پڑے پانی کے ڈول
 گود دیکھا۔ اور شہزادے نے گھوڑے کو ایدھ لگا دی اور تیز
 دوڑتے گھوڑے۔ کدک دم ٹھوکر لگی اور اس کے منہ سے
 چیخ نکل گئی۔

”کیا۔ کیا ہوا زیب! کوئی برا خواب دیکھا
 ہے۔“ استانی جی اپنی چار پائی پر اس کی طرف ہی رخ
 کیے سوئی ہوئی تھیں۔ اس کی چیخ سے ان کی آنکھ کھل
 گئی تھی۔

”شاید خواب میں ڈر گئی ہو۔ آیت الکرسی پڑھ
 کر خود پر پھونک لو۔ اور میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ
 چاروں قل پڑھ کر سویا کرو۔“
 ”جی پڑھ رہے تھے۔“ اس نے تکیے کے پاس مغل

کھینچیں اور رکاب میں پاؤں رکھ کر نیچے کودا۔ وہ
 ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اس کی طرف
 بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ اس کے سامنے آ کر رک گیا وہ
 مہوت سی اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”پانی“

اجنبی کے لبوں سے صرف ایک لفظ نکلا تھا۔ اس
 نے چونک کر پاؤں کے قریب پڑے ڈول کو دیکھا اور
 پھر اس کی طرف نظریں ملنے پر وہ مسکرایا اور ہاتھوں کی
 اوک بیٹائی۔ بتا کچھ کہے اس نے ڈول اٹھایا اور اس کی
 اوک میں پانی ڈالنے لگی۔
 وہ سر جھکائے پانی پی رہا تھا اور کچھ پانی اس کی
 انگلیوں سے نیچے گر رہا تھا۔
 ”بس“ پانی پی کر اس نے سراٹھایا۔
 ”مہربانی۔ شکریہ۔“

پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر گھوڑے کی زین سے
 بندھی زینیل سے مٹی کی چھاگل نکالی۔ اب وہ اس کے
 منہ پر لگا ڈھکن ہٹا کر اسے دیکھنے لگا تو اس نے بغیر کچھ
 کہے ڈول میں موجود پانی سے اس کی چھاگل بھردی۔
 ”میں نے تمہارا پانی لے لیا، اب تمہیں پھر بھرنا
 پڑے گا۔“ اس کے لبوں پر بڑی وقرب مسکراہٹ تھی۔
 ”کوئی بات نہیں۔“

وہ بھی مسکرائی تھی، اس نے ڈول میں بجا پانی
 گڑھے میں ڈالا اور ڈول کو پھر کنویں میں ڈالنے کے
 لیے کنویں پر لگی چرخ کو گھمانے لگی۔ رسی آہستہ آہستہ
 کھلتی جا رہی تھی اور ڈول نیچے جا رہا تھا۔ اس نے
 آگے بڑھ کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور
 خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

ڈول واپس کھینچ کر اس نے جگد کے پاس رکھا
 اور اشتیاق سے اسے دیکھنے لگا۔

”کون ہو تم؟ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور یا
 پرستان سے آئی ہوئی کوئی مہربان پری۔“

”میں زیب النساء“ اس نے اپنی طرف اشارہ
 کیا اور گھنی پلیمیں گلانی رخساروں پر جھک گئیں۔
 ”اور میں۔“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

کی تاریخ کو دیکھا جسے پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی، وہ
 کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا
 تھے زور سے کہ وہ اس کی دھک دھک سنتی تھی۔
 اب برا تو نہیں تھا بلکہ اس کی آنکھوں کے سامنے
 شہزادے کی صورت آ گئی تھی۔ جس کی رہنمی
 بڑی میں بڑا سا سرخ یا قوت تھا اور اس کے ارد گرد
 تھکنے تھے، سب سے روشنی پھوٹی تھی، وہ شہزادہ
 کے کوجما ہوا مائی رکھی کے کنویں تک پہنچا تھا۔

”شہزادہ“

اس نے تصور میں اس کے ایک ایک نقش کو
 ملا کی خوب صورت آنکھیں، کشادہ پیشانی اور
 پیشانی پر بکھرے شگلی بال، گداز بھرے بھرے ہونٹوں
 پر ایک سوچیں۔

اور وہ چوکی۔ وہ تو وہ شہزادہ تو اس نے گھبرا کر
 استانی جی کی طرف دیکھا انہوں نے دیوار کی طرف
 کروٹ لے لی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگالی
 اتنے اور چہرے پر آئے سینے کو پونچھا۔ کھلی کھڑکی سے
 چاند کی روشنی اندر گمرے میں آ رہی تھی۔

”میں بہت دور سے تمہیں کھوجتا ہوا آیا ہوں
 میری شہزادی۔“ اس کے کانوں میں جیسے کسی نے
 رگوں کی اس کے رخسار کی انجانی حدت سے تپ
 لئے۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ لیے
 اور سرگوٹی کی طرح اس کے لیوں سے نکلا۔

”میری شہزادی“ اور پھر یک دم گھبرا کر استانی
 جی کی طرف دیکھا وہ سوچیں تھیں۔ ان کے ہلکے ہلکے
 زانوؤں کی آواز آ رہی تھی۔ کیسا عجیب خواب تھا اور
 اس سے پہلے تو اس نے ایسا خواب کبھی نہیں دیکھا
 تھا۔ سفید ٹھوڑے پر سوار، دور دلیس سے آنے والا
 شہزادہ جو اسے کھوجتا ہوا مائی رکھی کے کنویں تک آیا تھا
 اور وہ بالکل استانی جی کے بیمار مہمان جیسا تھا۔ بالکل
 دیباہی۔ بس اس کا لباس شاہانہ تھا اور گلے میں قیمتی
 موتیوں کی مالا تھی۔ ہاں یہ خواب والا شہزادہ تو وہی
 تھا، وہی استانی جی کا مہمان اور صبح کا منظر آنکھوں
 کے سامنے آ گیا۔ کٹورے کی طرف بڑھتا ہاتھ اور

اس کے لرزتے ہاتھوں میں پکڑے کٹورے سے
 چھلکتا پانی اور وارنگی سے اس کی طرف دیکھتا وہ اجنبی۔
 اس کے نوخیز دل میں ہلچل مچانی اس کی نظریں۔ بس
 چند لمحوں کی بات تھی لیکن دل کی دنیا میں انوکھے، اور
 اچھوتے سے جذبے جاگ اٹھے تھے۔ اس نے
 بمشکل اس کے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

”پانی“ پیالہ اس کی طرف بڑھائے اب وہ اپنے
 پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن اجنبی کی نظریں اب
 بھی اس کے چہرے پر لگی تھیں اور ان نظریں کی حدت
 سے اس کے رخساروں پر سنبھل پھوٹ رہی تھی۔

”آپ کون؟“ اجنبی نے پیالہ اپنے دونوں
 ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”زیب النساء ماسٹر عبدالعزیز کی بیٹی۔“ بے
 اختیار ہی لیوں سے نکلا تھا۔

”زیب النساء“ اس نے بند لیوں سے دہرایا تھا
 اور پیالہ ہونٹوں سے لگالیا تھا، خالی پیالہ اس کو دیتے
 ہوئے وہ لڑکھڑایا تو بے اختیار اس کے لیوں سے نکلا
 تھا ”بسم اللہ سنبھل کر۔“ اس نے نظریں اٹھا کر اسے
 دیکھا۔

”شکریہ۔“

اور زیب النساء نے بمشکل اس کی سحر طاری
 کرتی آنکھوں سے اپنی نظریں ہٹائیں اور تیزی سے
 اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ لیکن وہ اس وقت تک
 چوکیٹ پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا جب تک وہ نظر
 آتی رہی اسے اپنی پشت پر اس کی نظریں محسوس ہوتی
 رہیں لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور کمرے
 میں جا کر اندر سے کنڈی لگائی تھی، جب تک استانی
 جی حکیم جی کو لے کر آئیں وہ باہر نہیں آئی تھیں۔
 ”استانی جی! آپ نے اتنی دیر کر دی۔“ استانی
 جی کے دستک دینے پر اس نے دروازہ کھولا تھا۔

”نہیں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی بس وہ حکیم
 صاحب دو مریض دیکھ رہے تھے کہنے لگے۔ میں
 ساتھ ہی چلتا ہوں مریض کو دیکھ کر ہی دوا دوں گا۔
 مریضوں کو فارغ کر کے آ گئے تھے۔“

”تو پھر کیا کہا۔ دوا دی۔“ اس نے دھڑکتے

دل سے پوچھا۔

”ہاں کہہ رہے تھے ساری علامات طبریہ والی ہیں۔ دوا بھی دے دی ہے۔“ استانی جی نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً نظریں جھکا لیں کہ کہیں استانی جی اس کی آنکھوں سے اس کے دل کا حال نہ جان لیں۔

”تم آ جاؤ ادھر باورچی خانے میں ہی۔ میں دودھ گرم کر کے اسے دے آؤں۔ حکیم صاحب نے کہا ہے دودھ کے ساتھ ہی دوا دینی ہے۔ بخار کچھ کم ہو گیا تو پھر کھانے کے لیے کچھ دینا ہے۔ میں آتے ہوئے آپاصغراں سے کہہ آئی تھی، وہ گندم کا دلیہ دے جائے گی تو وہ بنا لوں گی۔ اور تم دوپہر کے لیے روٹیاں پکالینا۔ آتا تو صبح ہی میں نے گوندھ کر رکھ دیا تھا۔ وال بھی گلا کر رکھ دی تھی بس تڑکھ لگانا ہے۔“

استانی جی واپس باورچی خانے کی طرف جانے لگیں تو وہ بھی، کمرے سے نکل کر ان کے پیچھے ہی باورچی خانے میں آ گئی۔

استانی جی کا باورچی خانہ ان کے باورچی خانے کے مقابلے میں بڑا اور کشادہ تھا۔ ایک طرف مٹی کے تیل والا چولہا پڑا تھا۔ ساتھ ہی لکڑیوں والا چولہا بھی سینٹ سے بنا ہوا تھا۔ اوپر چینی مٹی۔ دیواروں میں دو بڑی الماریاں تھیں جن میں برتن پڑے تھے۔ ایک طرف حمام تھا۔ حمام کا استعمال شدہ پانی باہر گلی میں جانے کے لیے کھرا تھا اور نالی بنی تھی۔ بائیں طرف والی دیوار کے ساتھ ان کے باورچی خانے کی طرح گدا بچھا تھا۔ چولہے کے پاس ہی دو بیڑھیاں پڑی تھیں۔ ایک چھوٹا سا نعمت خانہ بھی تھا۔ استانی جی نے نعمت خانے سے دودھ کی دہنی نکالی اور تھوڑا سا دودھ ایک دوسری دہنی میں ڈالا اور تیل والا چولہا جلا کر گرم کرنے کے لیے رکھ دیا وہ موڑھے پر بیٹھ کر استانی جی کی طرف دیکھنے لگی۔

”روٹی کب پکائی ہے۔“

”کچھ دیر تک پکالینا۔ ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ ہاں اگر تمہیں لگ رہی ہو تو۔“

”نہیں۔ میں تو ویسے بھی ابا اسکول سے

آ جا میں تب کھائی ہوں۔“ اس نے لٹی میں سر ہلایا۔ ”اچھا یہ اور ٹوکری میں تھوم (لہسن) پڑا ہے تڑکے کے لیے چھیل کر کاٹ دو۔ ہری مرچیں بھی ادھر ہی رکھی ہوں گی۔“ استانی جی نے دودھ گرم کرنے کے بعد کپ میں ڈالا اور لے کر چلی گئیں۔ اسے باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے، ہاتھیں کتنی دیر ہو گئی تھی اسے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اس نے وال گرم کر کے تڑکا لگالیا۔ دو چار برتن جو پڑے تھے دھو لیے۔ ٹوکری میں پڑے برتن سمیٹ لیے۔ باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے اس نے کتنی ہی بار دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا، یوں ہی بے خیالی میں شاید دل کے اندر کہیں خواہش چھپی تھی کہ وہ نظر آ جائے کیا خبر وہ باہر آئے۔ لیکن وہ باہر نہیں آیا تھا۔ ہاں استانی جی آ گئی تھیں۔

”ارے تم ابھی تک یہاں ہی بیٹھی ہو۔ کمرے میں چلی جاتیں۔ کوئی کتاب کتاب اٹھا کر پڑھ لیں ایسے ویلے (فارغ) بیٹھے بیٹھے تو بندہ تھک ہی جاتا ہے۔ بخار بہت تیز تھا بے چارے کو میں ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی اب جا کر بخار ذرا کم ہوا تو دوا دے کر آئی ہوں۔ تم روٹیاں ڈال لو تو کھانا کھا کر ذرا آپاصغراں سے پتا کروں۔ دلیہ نہیں بھیجا ابھی تک اس نے۔“

اور پھر روٹیاں پکا کر اس نے وہیں استانی جی کے ساتھ، باورچی خانے میں ہی کھانا کھایا تھا اور چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے ہوئے کئی بار اس کا جی چاہا وہ استانی جی سے پوچھے کہ حکیم جی نے کیا کہا ہے کہ بخار کب تک اترے گا۔ لیکن پھر جھج گئی کہ استانی جی پتا نہیں کیا سوچیں۔ لیکن استانی جی کھانا کھاتے ہوئے خود ہی بتانے لگیں۔

”حکیم جی کہہ رہے تھے طبریہ ہے دو تین دن تو خوب زور دے کر چڑھے گا۔“

”اور اقبال بھائی کب آئیں گے شکار سے واپس۔“ وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

”پتا نہیں۔ کبھی تو دو تین دن بعد آ جاتا ہے اور کبھی زیادہ دن بھی لگا دیتے ہیں۔ شکار کھینے والوں کی مرضی

دنی ہے کہ کتنے دن کھپ میں رہیں گے۔ کیا خبر اس کے لئے سے پہلے ہی اس کا بخار اتر جائے تو چلا جائے ہی لیکن ابھی تو اس کی حالت نہیں ہے ستر کرنے کی۔ دن کے بخار میں بخڑ کر رہ گیا ہے بچہ۔ استانی جی نے ہاتھ پونچھے اور کھڑی ہو گئیں۔

”بچہ۔“ اس نے سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ بھائی اور استانی جی کی طرف مصومت سے دیکھا۔ ”کیا اقبال بھائی بچوں کو بھی شکار پر لے کر جاتے ہیں۔“

”ارے نہیں بیٹی۔“ استانی جی کے لیوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ہماری عمر کے لوگوں کے لیے تو سب جوان جان لڑکے لڑکیاں بچے ہی ہوتے ہیں۔ یہ بھی گھبرو دیوان ہے اللہ اسے صحت و زندگی دے اور اس کے اس باب کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔“

واپس سے اسے دیکھا۔ نظروں کی نظروں میں سے پیغام دیتا وہ حسین چہرہ اس کے تصور میں لہرایا تو اس نے چور نظروں سے استانی جی کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ بلکہ دال والی دہچکی اٹھا کر نعت خانے میں رکھ رہی تھیں۔

”استانی جی، آپ رہتے دیں۔ من کر لوں گی سب آپ جا کر دلیہ لے آئیں۔“ اور استانی جی کے ہانے کے بعد اس نے پٹیلیں دھویں۔ باورچی خانہ تو صاف ہی تھا۔ ایک دو چیریں جو ادھر ادھر بڑی تھیں سنبھال کر دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ شاید اسے پیاس لگی ہو اور پانی کے لیے دروازے پر کھڑا ہو۔ لیکن قاطمہ آپا کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اور کتنا اچھا ہو کہ اسے پیاس لگ جائے اور وہ پانی مانگنے کے لیے دروازے تک آئے۔ دل کے اندر کہیں اس خواہش نے چنگی لی اور اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ کتنا اچھا ہے کہ کسی کو کسی دوسرے کے دل کا حال پتا نہیں چلتا تب ہی محسن کا دروازہ کھلا۔ استانی جی دلیہ لے کر آگئی تھیں ہاتھ ہی آپا صغراں کا گھر تھا۔ استانی جی نے آ کر

دلیہ والا پیالہ اسے پکڑ لیا۔ ”الہامی میں دیکھو کوئی خالی ڈبا ہے تو اس میں ڈال کر رکھ دو اس وقت آدمی پیالی ہی بناؤں گی۔ یوں تو کنب (گندم) گھر میں بھی تھی۔ تھوڑی سی بھون کر پیس کر بنا لیتی لیکن مجھے پتا تھا کہ آپا صغراں کے پاس بنا ہوا پڑا ہے۔“

”جی۔“ اس نے پیالہ پکڑ لیا۔ ”میں ذرا اسے دیکھ لوں پتا نہیں کس حال میں ہے پھر نماز پڑھ کر بنا لوں گی۔“

”میں بنا لوں گی استانی جی!“ اس اجنبی کے لیے اسے ہاتھوں سے کچھ پکنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے نماز پڑھ لو تم بھی۔“

”جی استانی جی میں غسل خانے میں چلی جاؤں وضو کرنے۔“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ٹوائیٹ اور غسل خانہ محسن میں تھا اور استانی جی نے اسے محسن میں جانے سے منع کیا تھا۔ استانی جی ہنس پڑیں۔

”لو اور کہاں جاؤ گی۔ میں نے احتیاطاً منع کیا تھا کہ نامحرم ہے۔ باہر نہ نکلتا۔ اب ضرورت کے وقت تو جانا ہی ہو گا نا۔ اچھا شریف اور خاندانی لڑکا لگتا ہے۔ خاندانی نجابت جیسے پیشانی پر لکھی ہے۔ ارے اس بچے کی پریشانی میں خیال ہی نہیں رہا۔ تمہارے ابا ابھی تک آئے نہیں۔ خیر ہو۔ رات تو خیر دیر ہو گئی ہو گی لیکن اس وقت تک تو آ جانا چاہیے تھا۔“

”کیا خبر آتے ہی سیدھے اسکول چلے گئے ہوں۔ سویرے والی وین نہ ملی ہو۔ اور دیر ہو گئی ہو۔“ اس نے خیال ظاہر کیا لیکن دل میں تھوڑی سی پریشان ہو گئی تھی۔ دل کو یقین تھا کہ ابا کتنی بھی دیر ہو جانی پہلے اس کی طرف ہی آتے۔

”چلو اللہ خیر کرے گا۔ نماز پڑھ کر دعا کرنا۔ میں پڑوس سے کسی بچے کو تمہارے ابا کے اسکول بھیجتی ہوں۔“ استانی جی اسے تسلی دے کر قاطمہ آپا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور وہ محسن کی طرف۔ اور ابھی وہ نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی کہ ناسر عبد العزیز آ گئے۔ وہ دعا مانگ کر باہر آئی تو وہ برآمدے میں

بیٹھے استانی جی سے کچھ کہہ رہے تھے۔

”ابا“ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

”در کیوں لگا دی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

”ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے اسے لپٹا کر اس

کے سر پر پیار کیا۔

”ای۔ او صاحب نے میٹنگ کے لیے

بلا یا تھا۔ وہاں سے سیدھا دھری چلا گیا تھا۔ رات

آنہ صبح بھی پہلی دین نکل گئی تھی۔

اب سیدھا تمہاری طرف ہی آیا ہوں۔“

”تو پھر چلیں ابا۔“

اس نے فاطمہ آپا کے کمرے کی طرف دیکھا۔

صبح سے دل میں ایک ہی خواہش چل رہی تھی کہ گھر

جانے سے پہلے ایک بار پھر اسے دیکھ لے وہ سحر طاری

کرتی اس کی سب سے حد خوب صورت آنکھیں۔ وارثی

اور حیرانی لیے اسے سمجھتی۔ وہ ابھی تک ان آنکھوں کے

سحر سے باہر ہی نہیں نکل پارہی تھی۔

اس نے اپنا دوپٹا درست کیا اور ایک گہری

افسردگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ماسٹر

عبدالعزیز ابھی تک کھڑے تھے نگاہیں جھکائے۔

استانی جی بھی کسی گہری سوچ میں تھیں۔

”ابا، کیا ہوا ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔“

”ہاں نہیں تو۔“ ماسٹر عبدالعزیز نے چونک کر

اس کی طرف دیکھا۔

”بیٹھ جائیں ماسٹر جی، اور تم زب جا کر جائے بنا لو

ماسٹر جی سفر کر کے آئے ہیں۔ بلکہ پتا نہیں کھانا بھی کھا پایا ہے

پائیں۔ کھانا کھائیں گے آپ ماسٹر صاحب۔“ استانی جی

بھی جیسے گہری سوچ سے باہر آئی تھیں۔

”نہیں استانی جی! کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں۔“

پریشانی میں بھوک پیاس اڑ جاتی ہے میری۔“

”پریشانی کیسی ماسٹر جی۔ یہ بھی تو زیب کا اپنا

ہی گھر ہے اس کے آجائے سے میرا وقت بھی اچھا

گزر جاتا ہے۔ دس کام بھی کر دیتی ہے میرے۔“

”بہت شکریہ آپا جی! آپ کے سوا کسی پر اعتبار

نہیں ہے مجھے۔“ وہ بیٹھ گئے تھے۔

”میرا دل تو بیٹھا جاتا تھا کہ اکیلے گھر میں کیے

اتنے دنوں کے لیے چھوڑ کر جاؤں۔ پہلے کی بات اور

تھی لیکن ماسی نور بھری اور اسلم کی دھمکی کے بعد اب

خوف آتا ہے، اگرچہ چوہدری صاحب نے اچھی

طرح سمجھا دیا تھا اسلم کو لیکن ابامرحوم کہتے تھے کہ اپنی

احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ کوئی نقصان ہو جائے تو بعد

میں واویلہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“

”سچ کہتے تھے آپ کے ابا جی۔ آپ بے فکر

ہو کر جائیں۔“

”کیا۔ کہاں جا رہے ہیں آپ۔ اور کیوں۔“

زیب النساء ہوتی سی کھڑی باری باری دونوں کو دیکھ

رہی تھی۔ urdushehar.com

”وہ دراصل ریفریشرز کورس ہو رہے ہیں۔ اس

کے لیے مجھے لاہور جانا ہے۔ دس دن کے لیے تو میں

نے استانی جی سے درخواست کی ہے کہ وہ تمہیں میری

واپسی تک اپنے پاس رکھ لیں۔“

ماسٹر عبدالعزیز نے بتایا تو زیب النساء کے دل

میں پھلجڑی سی پھوٹی۔ اس کے دل نے تو بس اتنی ہی

چاہ کی تھی کہ کاش ابا ایک روز اور اسے استانی جی کے

پاس چھوڑ دیں اور وہ بس ایک بار اور اسے۔ اس

شہزادوں کی سی آن بان والے شخص کو دیکھے اور۔ دل

کی چاہ پوری ہوگئی تھی، ابا اسے ایک دن کے لیے نہیں

نودس دنوں کے لیے استانی جی کے پاس چھوڑ کر

جا رہے تھے لیکن اتنے سارے دن وہ ابا کے بغیر کیے

رہے گی۔ وہ تو آج تک کبھی ان سے اتنے زیادہ دنوں

کے لیے جدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ افسردہ ہوگئی تھی۔

”ایک بات آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ کہیں

آپ کو اس پر اعتراض نہ ہو۔“ استانی جی کہہ رہی

تھیں۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”میرے گھر میں ایک مہمان ہے۔ بیار

ہے۔“ استانی جی ماسٹر عبدالعزیز کو تفصیل بتا رہی تھیں۔

”بخارا تر گیا تو چلا جائے گا۔ حکیم صاحب کہہ

رہے تھے دو تین روز تک بخارا تر جائے گا اور اگر

اقبال پہلے واپس آ گیا تو پہلے ہی چلا جائے گا۔ کسی

بہت اچھے خاندان کا لگتا ہے۔ آپ کو اس لیے بتایا ہے کہ بعد میں آپ کو اعتراض نہ ہو کہ گھر میں ایک بیٹی نامحرم مرد موجود تھا اور استانی جی نے زیب کو گھر سے نکال دیا۔

”نہیں آپا جی، مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ بہانہ تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اللہ آپ کو اس کی ہر درواری کا اجر دے گا۔ ہمارا آپ کے علاوہ اور کون ہے یہاں۔ میں کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتا کہ دو تین دن کے لیے کہیں اور چھوڑ جاؤں۔ آپ ہوں گی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی۔ آپ۔“ تب ہی فاطمہ آپا والے کمرے میں کچھ کرنے کی آواز آئی تو استانی جی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اللہ خیر۔“ اور تیزی سے کمرے کی طرف دوڑیں۔ ماسٹر عبدالعزیز بھی ان کے پیچھے ہی گئے تھے۔ زیب النساء وہیں برآمدے میں پریشان سی کھڑی تھی۔ یا اللہ سب ٹھیک ہو۔ کہیں وہ تو نہیں گرا آواز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ یا اللہ اسے کرنے سے کوئی چوٹ وغیرہ نہ آئی ہو۔ تب ہی استانی جی کمرے سے باہر آئیں۔

”زیب بیٹی، ذرا کمرے میں چلی جاؤ۔“ وہ یوں ہی پریشان سی کمرے میں چلی گئی تھی لیکن دروازے کی جھری سے دیکھنے لگی تھی۔ اب اسے سہارا لے کر محسن کی طرف لے جا رہے تھے۔ کیا وہ واپس جا رہا ہے۔ دل زور سے دھڑکا لیکن پھر اسے ٹو امکیٹ کی طرف جاتے دیکھ کر وہ مطمئن سی ہو کر دروازے کے پاس سے ہٹ کر چار پائی پر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد استانی جی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔

”زیب بیٹی! آ جاؤ تمہارے لیا انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔“ وہ دوپٹا اچھی طرح اپنے گرد لپیٹی ہوئی باہر آ گئی۔

”اچھا آپا جی! اب اجازت دیجیے۔ صبح جانے سے پہلے زیب کو چھوڑ جاؤں گا۔ اور ایک بار پھر آپ کا بہت شکریہ جب جب کوئی مشکل پڑتی ہے آپ ہمیشہ کام آتی ہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے لیے فاطمہ بیٹی

کے لیے دعا کرتا ہوں۔ آپ کا احسان مند ہوں۔“

”آپ شرمندہ کر رہے ہیں ماسٹر صاحب! میں نے ایسا کیا کر دیا ہے، اللہ زیب بیٹی کا نصیب اچھا کرے اور آپ کا سایہ اس کے سر پر سلامت رکھے۔ مجھے فاطمہ کی طرح ہی پیاری ہے۔“

استانی جی نے اسے ساتھ لگا کر بیمار کیا اور وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر محسن کی طرف بڑھی لیکن محسن عبور کرتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا شاید وہ دروازے میں کھڑا دھریں ٹکنا ہو۔ لیکن دروازہ نیم وا تھا اور وہ وہاں نہیں تھا۔ استانی جی باورچی خانے کی طرف جا رہی تھیں۔

گھر آ کر اس نے جلدی سے آٹا گوندھ کر بابا کے لیے روٹی پکائی آلو گھر میں پڑے تھے تو آلو کی بجھیا بنائی۔ ماسٹر عبدالعزیز نے راستے سے دودھ اور اٹھ لے لے لیے تھے۔ اس نے روٹی پکا کر چائے کے لیے پانی رکھ دیا تھا۔

”ابا، میں اتنے دن آپ کے بغیر کیسے رہوں گی۔ بہت یاد آئیں گے آپ نہ جائیں نا۔ کیا ضروری ہے جانا۔“ ان کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

”مجبوری نہ ہوتی تو بھی نہ جاتا بیٹی! پچھلے سال بھی نہیں جاسکا تھا۔ انجوائنٹن آفیسر صاحب نے کہا کہ حساب کے اساتذہ کے لیے ہی یہ کورس شروع کیے ہیں تو آپ کو جانا ہی ہوگا۔ بس تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ مجھے تم پر اور استانی جی پر بہت بھروسہ ہے۔ جہاں تک اس بچے کی بات ہے۔ اس حالت میں اس کے لیے سفر کرنا آسان نہیں ہے۔ ابھی بھی غسل خانے میں جانے کے لیے اٹھا تو چکر آیا اور گر گیا۔ کالی کمزوری ہے اسے۔ جانے کب سے بخار ہے۔ لیکن تم گھبراؤ مت، استانی جی کے ہوتے تمہیں کوئی ڈر نہیں۔ بس

خود بھی محتاط رہنا۔ دو تین روز میں بخارا تر جائے گا اور کمزوری بھی جاتی رہے گی تو چلا جائے گا۔“

انہوں نے سمجھا کہ وہ استانی جی کے گھر آ رہی ہیں۔ انہوں نے سمجھا کہ وہ استانی جی کے گھر آ رہی ہیں۔ انہوں نے سمجھا کہ وہ استانی جی کے گھر آ رہی ہیں۔

انہوں نے سمجھا کہ وہ استانی جی کے گھر آ رہی ہیں۔ انہوں نے سمجھا کہ وہ استانی جی کے گھر آ رہی ہیں۔ انہوں نے سمجھا کہ وہ استانی جی کے گھر آ رہی ہیں۔

خود بھی کچھ دیر کے لیے پریشان ہو گئے تھے لیکن پھر انہوں نے خود کو تسلی دے لی تھی کہ استانی جی زمانہ شناس اور سمجھ دار خاتون ہیں۔ کوئی دوسرا آپشن بھی تو نہیں تھا۔ زیب النساء نے رات کو اپنا اور ابا کا بیک تیار کر دیا تھا۔

”دیکھو اپنی ضرورت کا سارا سامان بیک میں رکھ لو، تاکہ پھر گھر آنے کی ضرورت نہ پڑے۔ پھر بھی اگر آنا پڑا تو اکیلی مت آنا استانی جی کو ساتھ لے کر آنا۔“ یہ کیسا خوف سائبٹھ گیا تھا دل میں ورنہ پہلے کب یوں خوف زدہ ہوئے تھے۔ گاؤں میں تو سب ہی ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ دن کے وقت کبھی کسی نے گھر کے اندر سے دروازوں کو کھنڈی نہیں لگائی تھی۔

بیمار ہے دو تین دن میں چلا جائے گا۔ کون سا اس نے یہاں ہی ڈیرہ ڈال کر بیٹھ جانا ہے۔ انہوں نے اپنے متذنب دل کو سمجھالیا تھا۔ اور زیب النساء کو بھی سمجھایا تھا اور اسے استانی جی کے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیکن اس اجنبی کا بخار تو اتر ہی نہیں رہا تھا۔ صبح کے وقت کم ہو جاتا دن کو زور دے کر چڑھ جاتا۔ شام میں پھر ذرا کم ہوتا اور رات کو پھر ہو جاتا۔ ”معیادی بخار ہے۔ ٹائیفائیڈ حکیم صاحب نے چار روز بعد جب بخار نہیں اترتا تو کہا۔“

”ملیریا ہوتا تو اس دو اسے اتر جاتا۔ اب پتا نہیں کتنے دن کا ہے نو دن کا بھی ہو سکتا ہے اکیس کا بھی۔ پر ہیز بہت ضروری ہے۔ روٹی وغیرہ بالکل نہیں دینی نہیں تو آنتوں میں زخم ہو جائیں گے صرف دودھ اور سا گودانہ دیں۔ یہ عرق وغیرہ پلائی رہیں۔“ استانی جی بہت پریشان تھیں۔ اقبال بھی نہیں آ رہا تھا کہ اسے لے جاتا اور شہر میں کسی ڈاکٹر کو دکھالیتا۔ وہاں تو خون چیک کر کے تصدیق بھی ہو جاتی۔ پتا نہیں کب سے ہلکا بخار ہو رہا تھا اس نے پرواہی نہیں کی اور بگڑ گیا۔ اسی لیے اتنی نقاہت ہے۔

پانچویں دن اقبال آیا تو لیکن بہت غلٹ میں تھا۔ ”مجھے ایک اور گروپ کو لے کر جانا ہے۔ وہ صادق آباد کے قریب ہی میرا انتظار کر رہے ہیں۔“

اور اسے تو اس قدر کمزوری ہے کہ چند قدم چلنا محال ہے اس کے لیے۔ آپ کو تو پتا ہے نا خالہ، یہ ہی کمائی کا وقت ہے میرے لیے۔ ورنہ میں خود اسے رحیم یار خان چھوڑ آتا وہاں اس کا دوست ہے، میں صادق آباد جا کر اسے فون کر کے یہاں کا سمجھا دوں گا وہ گاڑی میں لے جائے گا اور پھر اس کے گھر والوں سے رابطہ کر لے گا۔ میں تو بس کھڑے کھڑے اس کا پتا کرنے آیا تھا کہ اگر طبیعت ٹھیک ہے تو ساتھ لے جاؤں شکار کے لیے۔“

استانی جی اس کی اتنی لمبی بات سن کر خاموش ہو گئی تھیں۔ وہ کمزور تو بہت تھا پھر بخار ابھی تک اسی طرح تھا اور ان پانچ دنوں میں انہیں اس سے انسیت سی بھی ہو گئی تھی۔ اس کے ہونے سے کوئی مسئلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ زیب النساء زیادہ تر کمرے اور باورچی خانے میں ہی ہوتی تھی۔ اسے غسل خانے وغیرہ میں جانا ہوتا تو استانی جی کو آواز دیتا تھا اور پھر دیوار کا سہارا لیتا ہوا صحن تک جاتا، صحن سے غسل خانے تک جاتے کئی بار لڑکھڑا جاتا تھا۔

”ٹھیک ہے اقبال یاد! سے فون کر دینا اس کے دوست کو۔ اس لیے نہیں کہہ رہی کہ اس کی تیمارداری میرے لیے بار ہے۔ ثواب ہے کسی مریض کی دیکھ بھال کرنا اور کسی مسافر کا خیال رکھنا لیکن بیٹا، اس کا گھر ہوگا ماں باپ ہوں گے۔ وہاں زیادہ بہتر طریقے سے اس کا علاج اور دیکھ بھال ہو سکے گی۔ یہاں گاؤں میں اب حکیم جی ہی ہیں اور جوان کے بس میں ہے کر رہے ہیں۔“ انہوں نے اقبال کو تاکید کی۔

”ٹھیک ہے خالہ، جاتے ہی پہلے فون کر دوں گا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور عین اسی وقت زیب النساء باورچی خانے سے کمرے میں جانے کے لیے نکلی تو اقبال کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھی تھیں اور پھر باورچی خانے سے نکل کر کمرے تک اس کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔

”اقبال بیٹا! دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اس طرح

ہیہ کی۔
 ”ویسے یہ ہے کون خالہ۔“ اقبال کو جیسے ان کی
 ہیہ کی پروا ہی نہیں تھی۔

”ماسٹر عبدالعزیز کی بیٹی ہے۔“

”ارے یہ زیو ہے اتنی بڑی ہو گئی ہے۔“
 لڑکپن میں کئی بار اس نے زیب النساء کو قاطرہ
 کے پاس دیکھا تھا۔ جب بھی وہ یہاں آتا تھا اور
 اسے زیو زیو کہہ کر بلاتا تو وہ بہت چڑھتی تھی۔

”اقبال بھائی، میرا نام زیب النساء ہے زیو
 نہیں۔“ اس کے لیوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”بچپن میں بھی یہ بہت خوب صورت ہوتی تھی
 اب تو غضب ہی ڈھا رہی ہے۔“

”اقبال“ استانی جی نے ناگواری سے اسے
 دیکھا۔

”چلو اب سدھارو۔ اور اس کے دوست کو
 پیغام دیتا نہ بھولنا۔“ اقبال کے جانے کے بعد انہوں
 نے زیب النساء کو بھی سمجھایا تھا۔

”اب جب اقبال آئے تو باہر نہ نکلتا نہ تم اب
 چھوٹی بچی ہو اور نہ اقبال تیرے چودہ سال کا لڑکا ہے۔ نا
 حرم ہے تمہارا۔“

انہیں اقبال کا اس طرح زیب النساء کو دیکھنا اور
 ہر بے باکی سے اس کی تعریف کرنا پسند نہیں آیا تھا۔
 لیکن یہ سوچ کر کچھ کہتے کہتے رہ گئی تھیں کہ عقل ہی
 اتنی ہے۔ ماں نے بھی کچھ تہذیب نہیں سکھائی تھی۔

واپسی پر اقبال صرف چند منٹ کے لیے آیا تھا
 یہ بتانے کہ خود تو اس کی بات نہیں ہو سکی، اس کے
 دوست سے لیکن وہ ایک جاننے والے کو کہہ آیا ہے کہ
 اس کے دوست کو پیغام دے دے سارا اتا پتا بھی
 سمجھا دیا ہے۔

اور وہ دوست چار دن بعد آیا تھا کہ اسے پیغام
 ملا تو اسے ملا تھا کہ وہ کسی دوسرے شہر میں گیا ہوا تھا۔
 استانی جی جہاں خوش تھیں وہاں وہ بے حد افسردہ تھی۔
 لیکن اسے تو جانا ہی تھا۔ مسافر تھا ساری عمر تو یہاں

نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن یہ دن اس کے دل کے پنوں پر
 رقم ہو گئے تھے کبھی نہ مٹنے کے لیے۔ آتے جاتے دن
 میں ایک آدھ بار سامنا ہوتی جاتا تھا۔ وہ زبان سے
 کچھ نہ کہتا تھا لیکن اس کی نظریں باتیں کرتی تھیں ان
 نظروں میں اسلم کی نظروں جیسی بے حیائی نہ تھی نہ ہی
 اقبال کی نظروں والی بے باکی تھی۔ ان نظروں میں تو
 وارثی بھی پاکیزگی تھی۔ شفاف بے ریا آنکھوں میں
 ہوس نہیں تھی۔

استانی جی کسی کام سے باہر جاتیں تو وہ کمرے
 سے باہر نہیں نکلتی تھی لیکن ایک روز، وہ اپنے کمرے کا
 دروازہ ذرا سا کھولے اسے محسن کی طرف جاتے دیکھ
 رہی تھی۔ کہ وہ اسے دیکھتی تھی بھی کمرے کے
 دروازے کی جھری سے اور بھی باورچی خانے کی
 کھڑکی سے جو محسن کی طرف کھلتی تھی۔ اس روز بھی وہ
 اسے دیکھ رہی تھی جب اس نے برآمدے سے باہر
 محسن میں قدم رکھا تو یکایک، اس نے دونوں بازو
 پھیلائے تھے شاید چکر آ گیا تھا اسے اور پھر وہ سنبھل
 نہیں سکا۔ برآمدہ محسن سے ذرا سا اونچا تھا۔ وہ بے
 اختیار دروازہ کھول کر اس کی طرف لپکی تھی۔

”آپ استانی جی کا انتظار کر لیتے۔ یہ پاڑے
 سے دودھ لینے گئی ہیں۔“ اس نے بازو سے پکڑ کر
 اسے اٹھنے میں مدد دی تھی۔

”شکر یہ“ نظریں ملیں اور پھر جیسے ارد گرد سب
 غائب ہو گیا۔ کتنے ہی لمحے گزر گئے وہ ایک دوسرے کو
 دیکھتے رہے۔ محسن کی دیوار سے ملی نے چھلانگ لگائی
 تو دونوں چونکے۔ زیب النساء کی نظریں جھک گئیں
 رخساروں پر شفقت کی سرخی بکھر گئی۔ لاجبی مڑی ہوئی
 پلکوں کی لرزش کو اجنبی اب بھی دیکھتی اور وارثی سے
 دیکھ رہا تھا۔ وہ مڑی تو اس نے بے اختیار آواز دی۔
 ”ستو“ اس نے برآمدے میں قدم رکھتے

ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔
 ”تم بہت اچھی ہو زیب النساء۔“
 استانی جی نے کئی بار اسے کسی کام کے لیے
 آواز دی تھی تو تب ہی اسے اس کا نام معلوم ہوا تھا۔

زیب النساء کے رخساروں پر بکھری شفق گہری ہوئی
اور لیوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”میں اپنے ان چکروں سے سخت تنگ تھا کہ
زمین آسمان سب جیسے الٹ پلٹ ہو جاتے تھے لیکن
آج ان کا شکر گزار ہوں کہ وہ جو چھپ چھپ کر مجھے
دیکھتی تھی آج رو برو دیکھ لیا پورے ہوش و حواس
میں۔“

”نہیں۔ میں۔“ اور کچھ کہنے کی کوشش میں اس
کے ہونٹ لرز کر رہ گئے تو اجنبی کے لیوں پر شر پری
مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”کیوں۔ کیا تم مجھے چھپ چھپ کر نہیں دیکھتی
ہو۔“ وہ گھبرا گئی۔ بیٹانی پر پسینے کی بوندیں نمودار
ہوئیں۔

”میں بھی تمہیں چھپ چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا
لیکن تم دیکھتی ہی نہیں تھیں۔“ اس کی مسکراہٹ گہری
ہوئی تھی۔

”میرا بخار پوری طرح اتر نہیں رہا تھا۔ کمزوری
بھی تھی اور یہ چکروں کی مصیبت بھی تھی لیکن پھر بھی
اب اس قابل تھا کہ یہاں سے رحیم یار خان چلا
جاتا۔ لیکن نہیں گیا۔ جانتی ہو کیوں۔ تمہیں ایک یار
پورا مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔ بھی جو ایک جھلک نظر آتی
تھی اس سے شکلی بڑھتی تھی۔ اب چلا جاؤں گا۔ لیکن
پھر آؤں گا۔ بہت جلد۔“

اور زیب النساء کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا
تھا کہ اسے لگتا تھا جیسے ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر
باہر نکلے گا۔ ایک بھر پور نظر اس پر ڈال کر اس نے
خمن کی طرف رخ کیا اور فوراً ہی ہر تمام کر رک گیا۔

”سبجل کر“ بے اختیار اس نے ایک قدم اٹھایا
تو اجنبی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

”میں چلا جاؤں گا۔ تم اب جاؤ۔ استانی جی گھر
پر نہیں ہیں اور اگر کوئی آ گیا تو میں نہیں چاہتا کہ کسی کی
انگلی تمہاری طرف اٹھے اور استانی جی کو اپنی اس نیکی پر
شرمندگی ہو۔“

وہ تیز تیز چلتی ہوئی کمرے میں آ گئی تھی۔ دل

اسی طرح دھڑک رہا تھا۔ اس اجنبی کے لیے دل میں
جو محبت کا احساس پیدا ہوا تھا اس میں عقیدت بھی
شامل ہو گئی تھی۔

پھر دو دن بعد اس کا دوست گاڑی لے کر اسے
لینے آ گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے استانی جی
سے جانے کیا کہا تھا کہ وہ اسے کھوجتی نظروں سے
دیکھتیں۔ یوں جیسے اس کے اندر تک کا حال جان لینا
چاہتی ہوں۔ لیکن وہ نظریں جھکا لیتی۔ یوں ہی کوئی
بات چھیڑ دیتی تاکہ استانی جی کا دھیان اس کی طرف
سے ہٹ جائے، اجنبی کے جانے کے تین دن۔

بعد ماسٹر عبدالعزیز آ گئے تھے اور استانی جی کا شکریہ ادا
کر کے اسے گھر لے گئے تھے۔

وہ اجنبی نو دن استانی جی کے گھر رہا تھا۔ اور

زیب النساء آٹھ دن۔ ان آٹھ دنوں میں وہ چھپ
چھپ کر اسے دیکھتی رہی تھی۔ اور بس دوبار آنا
سامنا ہوا جب وہ اسے پانی دینے گئی تھی اور جب وہ
محن میں گرا تھا اور وہ اسے سہارا دے کر اٹھانے کے
لیے گئی تھی، بس اس دوسری بار میں چند جملے۔ وہ ان
چند جملوں کو سینکڑوں بار دہرا چکی تھی۔ نہ کوئی
عہد دیا نہ ہوئے تھے نہ محبتوں کا دعویٰ کیا گیا تھا پھر
بھی وہ ہتھیلیوں پر انتظار کی شمع جلائے بیٹھی تھی۔

”میں پھر آؤں گا بہت جلد۔“ بس یہ چند لفظ

تھے جو اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے اور دل میں
امید کی شمع جلا گئے تھے۔ اس کا خوش گمان دل کہتا تھا
کہ وہ آئے گا۔ اس میں صرف وہ ہی نہیں۔ وہ بھی
اسیر ہوا تھا۔ وہ سوچتی آبا کہتے تھے اماں سے کہ میری
بچی کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا۔ اور کیا یہ وہی
شہزادہ ہے۔ جو میرے لیے یہاں آیا تھا اور اسے
انتظار کی شمع تھما کر چلا گیا تھا اور اسے اپنا خواب یاد
آ جاتا، سفید گھوڑے پر سوار وہ شہزادہ سلیم۔

وہ جو بالکل اس اجنبی کی طرح تھا۔

اس کا شہزادہ سلیم۔ لیکن وہ اس کی انارکلی نہیں
تھی۔ وہ تو اس کی نور جہاں تھی۔ اس کی ملکہ راج
کرنے والی۔ اس کے دل پر اور اس کی ریاست پر

مادرہ نہیں بننا تھا، تاکام نامراد اسے تو مہر النساء
 ہاتھ پامراد کامیاب لیکن کیا وہ واقعی کامیاب اور
 راد ہو سکتی ہے۔ اس نے سینکڑوں بار سوچا تھا۔ ایک
 غائب ایک چھوٹا سا جملہ۔ ”میں پھر آؤں گا بہت
 جھلفٹوں پر مشتمل یہ چھوٹا سا جملہ دل میں امید
 شمع جلائے ہوئے تھا لیکن بھی وسوسوں کی تیز
 سے یہ شمع بجھنے لگتی۔ اور اسے لگنے لگا کہ وہ نہیں
 بے گاہ وہ شاید بھی نہیں آئے گا، لیکن وہ آ گیا تھا
 رانی جی کے پاس۔ اور وہ بے خبر تھی۔

”میں نے جانے سے پہلے آپ سے کہا تھا کہ
 میں پھر آؤں گا آپ سے کچھ مانگنے تو میں آ گیا ہوں
 رانی جی، میں زیب النساء سے شادی کرنا چاہتا
 ہوں مجھے نہیں علم کہ اس کا آپ سے کیا رشتہ ہے۔
 بل انتہائی نظر اس پر پڑی تھی ہمیشہ سے میرے ذہن
 میں اپنی بیوی کے لیے ایسا ہی ایک تصور تھا، ایک ایسی
 کی جس کی آنکھوں میں حیا ہو چہرے پر پاکیزگی
 اور آپ کی زیب النساء ایسی ہی ہے۔“
 استانی جی نے اس کی باتوں کو کل سے سنا تھا۔
 اسے ماسٹر عبدالعزیز اور زیب النساء کے متعلق
 کیا۔

”تم سے بہتر زیب النساء کے لیے میری نظر
 کوئی اور رشتہ نہیں ہے لیکن بیٹا، رشتہ لینے کا یہ
 رشتہ نہیں ہوتا کہ لڑکا خود ہی منہ اٹھا کر چلا آئے
 نہ مانگنے۔ کیا تمہارے کوئی بزرگ نہیں ہیں کسی
 کے کو لاؤ رشتے کے لیے تو میں ماسٹر صاحب سے
 ت کرتی ہوں۔“ اور وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے استانی جی، میں جلد ہی کسی بڑے کو
 لے کر آؤں گا۔ مجھے بس یہ اطمینان چاہیے تھا کہ اس
 ارشتہ ابھی تک نہیں ہوا آپ ماسٹر جی کے کانوں
 میں یہ بات ڈال دیں کہ میں بھی زیب النساء سے
 شادی کرنا چاہتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ میرے آنے سے
 پہلے وہ کسی اور کو ہاں کر دیں۔“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا
 کہ وہ کیسے اور کن لفظوں میں اپنا اعلان
 کرے۔ استانی جی اس کی بوکھلاہٹ پر مسکراتی

تھیں۔ ”لیکن دیر نہ کرنا بیٹا ماسٹر جی اس کی جلد از جلد
 شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ اور وہ چلا گیا تھا پھر جلدی
 آنے کے لیے۔

اور ابھی استانی جی نے ماسٹر صاحب سے کوئی
 بات کی ہی نہیں تھی کہ اقبال آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح
 استانی جی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔

”کیا آج بھی شکاریوں کے ساتھ آئے ہو۔“
 ”نہیں خالہ، آج تو صرف آپ سے ملنے کے
 لیے آیا ہوں۔“

”جیتے رہو۔“
 ”خالہ۔“ کھانا وغیرہ کھا کر اس نے جھکتے
 ہوئے کہا۔

”میں شادی کرنا چاہتا ہوں خالہ۔ بہن
 بھائیوں کو تو میرا کوئی خیال نہیں سب اپنی اپنی
 زندگیوں میں مگن ہیں۔ ماں باپ ہوتے تو میرا
 سوچے، اب آپ ہی میری بڑی ہیں بزرگ ہیں۔
 آپ نے ہی میرے لیے کچھ کرنا ہے۔ سچ بتاؤں تو
 تنہا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ گھر جانے کو جی ہی
 نہیں چاہتا۔“ وہ ان کے گھٹنے ہی پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

”میں دیکھوں گی تمہارے لیے کوئی لڑکی۔
 قاطعہ سے بھی کہوں گی لیکن اقبال بیٹا، کوئی مستقل کام
 تو کرو پہلے۔ یہ تو ہوائی روزی ہے تمہاری۔ لڑکی
 والے کم سے کم اتنی ذمہ داری کرتے ہیں کہ لڑکا کام
 کرتا ہو۔ دس جماعتیں پڑھ رہی ہیں کہیں کسی دفتر میں
 ہی کلرک وغیرہ کر رہی دیکھ لو۔ قاریغ ہوتے ہو تو
 ٹائپنگ وغیرہ کر لو۔ کڑی ملنے میں آسانی ہو جائے
 گی۔“

”ٹھیک ہے خالہ، میں جلد ہی کوئی مستقل کام
 کر لوں گا۔ یوں بھی ایک بندے نے وعدہ کیا ہے مجھ
 سے کہ باہر بھجوادے گا مجھے، تو بس پھر نوٹ ہی نوٹ
 ہوں گے۔“ عیش کرے گی میری بیوی۔“

استانی جی کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ نمودار
 ہو کر معدوم ہو گئی، وہ پچھلے کئی سالوں سے اس طرح

کی اس کی باتیں سنتی آرہی تھیں۔

اور خالہ، لڑکی ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔“
اس نے استانی جی کا گھٹنا دایا۔

”وہ ہے ماسٹر جی کی بیٹی زیب النساء۔ اس کے لیے ماسٹر جی سے بات کریں نا۔ وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔“

استانی جی چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں پھر نرمی سے اس کے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے ہٹائے۔

”ٹھیک ہے میں ماسٹر صاحب سے بات کروں گی، آگے ان کی مرضی“ اور اس روز جب ماسٹر صاحب زیب النساء کو اسکول جاتے ہوئے چھوڑنے آئے تو استانی جی نے دونوں رشتے ان کے سامنے رکھ دیے۔

”آپ نے کہا تھا ماسٹر صاحب، کہ زیب بیٹی کے لیے کوئی رشتہ ہو تو آپ کو بتاؤں۔ آپ کو یاد ہے وہ لڑکا جو بیمار ہو کر کچھ دن میرے گھر رہا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں یوں ہی ذکر کیا کہ وہ کسی باحیا اور سادہ سی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میرے ذہن میں اپنی زیب کا خیال آ گیا تو میں نے اس سے کہا کہ ایک لڑکی ہے تو میری نظر میں وہ اپنے والدین کو لے کر آ جائے تو پھر بات کرنی ہوں۔ لڑکے نے سی ایس۔ ایس کا امتحان دے رکھا ہے۔ اچھا خاندان پڑھی لکھی فیملی۔ اگر یہ رشتہ ہو جائے تو ہماری زیب کا نصیب کھل جائے۔“

استانی جی نے بڑے سجاؤ سے بات کی تھی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ماسٹر صاحب کو لڑکے کی پسندیدگی کا گماں ہو کہ وہ زیب النساء کو ان کے حوالے کر کے گئے تھے اور انہیں خیال گزرے کہ زیب النساء لڑکے کے سامنے آتی جانی رہی ہے۔

”لڑکا اتنا پڑھا لکھا ہے اور اتنے اچھے خاندان کا ہے وہ بھلا ہم غریبوں کے ہاں کیوں اپنے والدین کو رشتے کے لیے لائے گا۔“

انہیں لگا تھا کہ استانی جی اپنی سادگی میں یوں ہی خوش گماں ہو رہی ہیں۔

”اچھی امید رکھنی چاہیے ماسٹر صاحب، جوڑ تو اللہ ہی ملاتا ہے۔ ہم نے تو بس ایک کوشش ہی کرنی ہے۔ اقبال کو تو آپ جانتے ہیں۔ وہ بھی خواہش مند ہے۔ لیکن وہ جم کر کوئی کام کاج نہیں کرتا۔ گھر بھی ہے اپنا۔ پیسہ وغیرہ بھی جمع کر رکھا ہے اور کوئی برائی بھی نہیں ہے۔“

میں نے اس سے کہا ہے کہ پہلے کوئی نوکری کرو۔ اور کچھ نہیں تو چھوٹی موٹی دکان ہی بنا لو پھر بات کروں گی۔“

”بہت شکریہ آیا جی۔ آپ سے زیادہ زیب النساء کا کون خیر خواہ ہو سکتا ہے۔ دعا کیا کریں میری زیب کے لیے کہ اپنی زندگی میں اسے اپنے گھر کا کردوں۔ میں چوہدری عبدالمالک صاحب سے بھی مشورہ کروں گا۔ اگر وہ بچہ اپنے والدین کو رشتے کے لیے لایا تو، اقبال سے بھی آپ نہ ٹھیک کہا پہلے کوئی کام کاج کر لے تو سوچوں گا اس لیے شعل۔“ انہوں نے استانی جی سے تو کہہ دیا تھا لیکن انہیں امید نہیں تھی وہ اپنے والدین کے ساتھ رشتہ مانگنے آ جائے گا۔ اسی لیے انہوں نے چوہدری عبدالمالک سے بات نہیں کی تھی۔ اور ٹھیک دس دن بعد وہ آ گیا تھا لیکن اپنے والدین کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے کسی دوست کے والدین کے ساتھ ماسٹر عبدالعزیز پریشان سے ہو گئے تھے۔

”آپ کے والدین کیا اس رشتے کے لیے رضامند نہیں ہیں بیٹا!“

”میں نے دراصل ابھی گھر میں بات ہی نہیں کی، مجھ سے بڑے تین بھائی ہیں میرے۔ ابھی بڑے بھائی کی شادی ہونے والی ہے اور کچھ پریشانی بھی ہے ان دنوں گھر میں تو۔ میرے والدین پڑھے لکھے ہیں زبردستی کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے جب بھی میں نے بات کی وہ انکار نہیں کریں گے۔“

”تو ٹھیک ہے بیٹا، جب آپ کے بھائیوں کی شادیاں ہو جائیں اور آپ اپنے والدین سے بات کر لیں تو انہیں ساتھ لے کر آئیے گا۔“ ماسٹر عبدالعزیز

کمرے کے لیے صحن میں آگئی تھی۔ اس کی پلکیں لرز رہی تھیں اور رخساروں پر سرخی تھی۔

”میں نے استانی جی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ناراض ہوں گی کہ میں کمرے سے باہر کیوں نکلی۔ یہ غیر اختیاری طور پر ہوا تھا ابا، کیا آپ ناراض ہیں مجھ سے۔“ اس نے نظریں اٹھائیں تو ان میں آنسو چمک رہے تھے۔

”نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

”میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا تھا گمان گزرا تھا کہ اس نے تمہیں دیکھا ہو گا تب ہی تو تمہارا رشتہ لے کر آیا ہے۔“ وہ مسکرائے تھے اور اس نے سکون بھرا گہرا سانس لیا تھا۔ اور غم آنکھوں میں جگنو سے جھکے تھے اور ماسٹر عبدالعزیز نے بے اختیار دعا کی تھی۔

urdushehar.com

”یا اللہ اسے میری بیٹی کا نصیب بنا دے۔“ اور کوئی لمحہ ہوتا ہے ایسا جب دل سے نکلنے والی دعا رد نہیں ہوتی۔ اور ان کی دعا بھی رد نہیں ہونے والی تھی۔

☆☆☆

نومبر کا آغاز تھا۔ فضا میں ہلکی خنکی تھی۔ لیکن صحن میں دھوپ پھیلی تھی، جس کی تپش برآمدے تک آرہی تھی کہ برآمدے کے فرش پر بھی دھوپ کہیں کہیں پھیلی ہوئی تھی۔ زل دیوار سے ٹپک لگائے تخت پر بیٹھی صحن میں پھیدکتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ تخت پر دھوپ نہیں پڑ رہی تھی لیکن دھوپ کی حدت محسوس ہو رہی تھی جو اچھی لگ رہی تھی۔ پاس بی بی بی اماں بیٹھی اون اور سلائیوں سے الجھ رہی تھیں۔ زل گا ہے گا ہے ان کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ بہت سارے تھکا دینے والوں دنوں کے بعد آج وہ ذرا ریلیکس ہوئی تھی تو بی بی اماں کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

”بی بی اماں! آج کل ہاتھ کے بنے ہوئے سویٹر کون پہنتا ہے۔ آپ خواجواہ کھکتی رہتی ہیں۔“

”ارے سارا دن مجھ سے فل بازو والی کوئی نہیں

دل نہیں مانتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ ایسے کسی لڑکے کے ساتھ کر دیں جس کے والدین کی رضا مندی نہ

”لیکن کیا آپ انتظار کر لیں گے۔“ اس کے

”ہاں مجھے بھی کوئی جلدی نہیں۔ ابھی میری بیٹی نے ایف۔ اے کا امتحان دینا ہے۔ پھر میں اسے بی اے کے لیے کالج میں داخل کروادوں گا۔“ انہیں وہ لہجہ لگا تھا۔ سمجھ دار اور تعلیم یافتہ اور خاندانی اپنی بی بی کے لیے وہ ایسے ہی کسی شہزادے کا خواب کہتے تھے۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ بغیر سوچے سمجھے وہ اسے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھما دیتے۔ تاہم انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس کے والدین کا انتظار کریں گے لیکن اگر اس دوران کوئی اچھا رشتہ آ گیا تو وہ اسے انتظار نہ کر سکیں گے۔ یہ بات انہوں نے آنے والوں کو بھی بتادی تھی اور اس وقت اس لڑکے کی گھٹوں کی چمک ذرا سی دیر کو ماند ہو گئی تھی۔

”ان شاء اللہ بڑے بھائی کی شادی کے بعد گھر میں بات کروں گا۔“

وہ واپس چلے گئے تھے لیکن زیب النساء کے دل میں ماند ہوتی امید کی روشنی پھر سے بڑھ گئی تھی۔ آگیا تھا تو وہ پھر ضرور آئے گا۔ اسے یقین تھا اور ماسٹر عبدالعزیز نے بھی کئی روز تک استانی جی کی طرح بے کھوجتی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر ایک روز اس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ بیٹھے تھے۔

”زیب! ایک بات پوچھوں بیٹی۔“

”جی ابا۔“ وہ نظریں جھکائے ان کے سامنے

”استانی جی کے مہمان کی کبھی تم پر نظر پڑی

”جی ایا۔“ اس کا سر جھک گیا وہ ابا سے جھوٹ

”استانی جی گھر پر نہیں تھیں اور وہ صحن میں گر گیا

میں بے اختیار بالکل غیر ارادی طور پر اس کی مدد

پہنی جاتی۔ یہ ہاف بازو والا سویٹر بناؤں گی۔“
انہوں نے شارے سے اون کا لچھا نکالا۔
”ہاف بھی تو بازار سے مل جاتا ہوگا۔ مجھے شاور
آئی کے لیے گفت لینے جانا ہے تو لے آؤں گی آپ
کے لیے۔“

شاہ ظفر یاب کی بیٹی تھی۔ ظفر یاب اپنی بیوی اور
بیٹی کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔
اور دو تین روز میں واپس جانے والے تھے۔ اکتوبر
کے دوسرے ہفتے میں وہ شادیوں سے تو فارغ ہو گئے
تھے لیکن پھر دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ خود ان
کے ہاں شانزہ کے سیرال سمیت سب کی دعوت چند
دن پہلے ہی ہوئی تھی۔ سو اس مصروفیت میں وہ
مارکیٹ جا ہی نہیں سکی تھی کہ ان کے لیے گفت خرید
سکے۔ دادا جان نے بھی ان کے لیے سوٹ خریدنے کو
کہا تھا۔

”نہ۔ مجھے تم اون لا دینا بس اپنا بنا کر تمہارے
لیے اسکارف بناؤں گی۔ دل لگا رہتا ہے میرا بھی ان
اون سلاخیوں میں۔“ بی بی اماں کو فارغ بیٹھنا پسند نہ
تھا گرمیوں میں دوپٹوں پر کڑھائی کرتیں۔ کروشیے
سے لیس بناتیں اور سردیوں میں بھی جو فارغ وقت
ملتا۔ سب کے سویٹر بناتی رہتیں۔ کبھی کسی کے لیے
کبھی کسی کے لیے۔

”ٹھیک ہے بی بی اماں! اون لے آؤں گی۔“
زل پھر محسن کی طرف دیکھنے لگی تھی جہاں اب چڑیاں
موجود نہیں تھیں۔

”یہ شانزہ مجھے خوش نہیں لگتی زل!“ بی بی اماں
لچھے کو گھٹنوں پر چڑھائے گولا بنا رہی تھیں۔ ”اس کے
چہرے پر نئی نوپلی دہنوں والی رونق اور خوشی نہیں ہے تم
نے غور کیا تھا ہمارے ہاں کی دعوت میں بھی کتنی چپ
چپ لگ رہی تھی اور پھر کتنی ساداسی تھی نہ کوئی زیور نہ
کام والے کپڑے، بس کان میں وہ ذرا ذرا سے ٹاپس
تھے۔“

”دراصل عقیل بھائی کو یہ اس طرح کے چمک
دک والے کپڑے اور تام جھام پسند نہیں ہے بی بی

اماں اس حشر بتا رہی تھی کہ عقیل بھائی نے تو پہلے روز کم
پہنچتے ہی کپڑے تبدیل کرنے اور منہ ہاتھ دھونے کو
کہہ دیا تھا۔“ زل نے بتایا تو وہ حیران ہوئیں۔
”تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا۔“ اور پھر لمحہ بھر بعد
سر ہلایا۔

”چلو بھڑکیلے چکیلے کپڑے پسند نہیں عقیل میاں
کو نہ سہی کئی مردوں کو نہیں پسند ہوتے پر ایسا بھی کیا کہ
چار دن بھی پتا نہ چلے کہ نئی نوپلی دہن ہے۔ چہرے پر
بچی خوشی کی کوئی ریش نہ تھی اللہ خوش رکھے اپنی ماہوش
کو کیسی دیک رہی تھی، خوشی۔ اس کے پورے وجود
سے پھوٹی تھی۔“ بی بی اماں بھلے اور والوں سے ان
کے مزاج و عادات کی وجہ سے چڑنی تھیں لیکن سب
سے انیت اور محبت تھی۔ سب کی خوشیوں اور اچھے
نصیب کے لیے دعا گو رہتی تھیں۔

”شانے اجنبی لوگوں اور اجنبی ماحول میں گئی
ہے جبکہ ماہا اپنے ہی گھر میں ہے تو شاید اس لیے۔ کچھ
وقت لگے گا شانے کو وہاں ایڈجسٹ ہونے میں تو
ہو جائے گی ان شاء اللہ۔“
زل بھی بھی شانزہ کو شانے اور ماہوش کو ماہا کہہ
کر بلاتی تھی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو پر سچی بات ہے مونا اور
رخسانہ نے صرف دولت ہی دیکھی یوں تو بہت سائی
بنتی ہیں لیکن صرف پیسہ، گڈیاں (گاڑیاں) اور پنکٹے
ہی دیکھے ہیں۔ شکل کا بھی ایسا شہزادہ نہیں تھا کہ مرثی
ہماری شانزہ لاکھوں میں ایک ہے۔ شہزادی لگتی ہے۔
چلو مرد کی شکل و صورت کوئی نہیں دیکھتا لیکن کوئی اور
گن بھی تو ہوں۔ ایسا بد مزاج سا کہ ہمارے ہاں کی
دعوت میں سارا وقت تیوریاں چڑھائے بیٹھا ہمارے
کتنا اچھا تھا اور رقیہ کی بھی کتنی خواہش تھی۔ پڑھا لکھا
تھا۔ چند سالوں میں گاڑی بھی لے لیتا پھر ایسے
غریب بھی نہ تھے۔ اپنا گھر۔ رقیہ ملی تھی شادی میں،
کہہ رہی تھی بہت اچھی نوکری مل گئی ہے اسے۔ مجھے تو
پہلے روز سے ہی چھپھورے لگے تھے تو ددی لیتے
خاندانی لوگوں والے طور طریقے نہیں تھے ان

”بی بی اماں کو عمر کے لیے رشتے سے انکار کا بھی
ہی دکھ تھا۔“

”پتا ہے وہ وہ ویسے میں بھی آپا کی بیڑوں ملی تھی
نے سب آگ چھپا بتا دیا مجھے کہہ رہی تھی۔ عقل
کے پردہ دار کی وہاں قصور میں چھوٹی سی پرچون کی
کان ہوتی تھی۔ عقل کا دادا کسی پارٹی سے منسلک ہوا
پارٹی کی مدد سے بلدیاتی الیکشن میں کامیاب
ہو گیا۔ اور پھر بیٹا یعنی عقل کا باپ صوبائی اسمبلی تک
چن گیا۔ بس پھر تو باپ بیٹا نوٹ چھاپنے لگے۔ حرام
کی کمائی سے مل بھی لگالی۔ سوتہ بنتا ہے وہاں۔ بتا رہی
تھی اس کی بھانجی کو بلدیہ کے اسکول میں نوکری
دلوانے کے لیے دو لاکھ رشوت مانگ لی تھی عقل کے
اپنے۔ عقل تو سب بہن بھائیوں سے چھوٹا ہے
بھونہ میں سونے کا چھچھ لے کر پیدا ہوا ہے۔“

زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ شاید بارہ یا چودہ
جماعتیں پاس ہے۔ بڑے بہن بھائی تو کافی پڑھے
لکھے ہیں۔ پارٹی والے بڑا سپورٹ کرتے ہیں
نہیں۔

وہ ایک وزیر بھی تو آیا ہوا تھا ویسے میں۔ ایک
ہمارے ظفریاب تھے مصیبت پڑی تو پارٹی والوں
نے پوچھا تک نہیں۔ یہ تو صوبی اتنی بھاگ دوڑ نہ
کرتی تو ہمیں کہاں پتا چلنا تھا ظفریاب کا۔ پارٹی
والوں نے عقل کو کوئی بڑا ٹھیکہ دلوایا ہے۔ جانے کس
جزیرہ کا۔ یہ اسے علم نہ تھا۔ ارے باتوں باتوں میں غلط
بہن دیا سارا۔“ وہ چونک کر بنے ہوئے حصے کو دیکھنے
لگیں۔

”یہ جو اتنی دیر سے آپ کر رہی ہیں بی بی اماں،
کیا یہ غیبت میں شمار نہیں ہوگا۔“ زیل نے انہیں دیکھا
جواب بنے ہوئے حصے کو ادھیڑ رہی تھیں۔

”اللہ مجھے معاف کرے۔“ انہوں نے فوراً ہی
کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”پر کیا کروں میری آنکھوں کے سامنے سے
شانزے کا چہرہ ہی نہیں جاتا ویران روکھا پھیکا سا۔ سچی
بات ہے جب سے وہ ہمارے ہاں کی دعوت سے گئی

ہے میں تو اسی کے متعلق سوچ، سوچ کر پریشان ہوتی
رہتی ہوں کیسی سہمی سہمی اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ پر تیری
بتائی کی آنکھوں کے آگے تو دولت کی پٹی بندھی ہے۔
بیٹی کا اجاڑ چہرہ نظریں نہیں آ رہا تھا بس سدھن کے
آگے پھٹی جا رہی تھی۔“ وہ اب ایک ایک خانہ سلائی
پر اٹھا رہی تھیں۔ سب خانے اٹھا کر انہوں نے ایک
تقیدی نظر اس پر ڈالی اور اون سلائیاں شاہر میں
رکھیں۔

”اس وقت دماغ کام نہیں کر رہا ہے بعد میں
بتاؤں گی۔“

سنو تواب کے شانزہ آئے تو پوچھتا تو سہمی کہ
کہیں مار پیٹ تو نہیں کرتا وہ کیا کہتے ہیں آج کل
ڈنٹی مریمض تو نہیں ہے۔

”اللہ نہ کرے بی بی اماں، آپ تو مجھے بھی ڈرا
رہی ہیں۔ مونا بتائی بتا رہی تھیں بہت خوش ہے اپنے
گھر میں۔ ابھی گھومنے کے لیے جا رہے ہیں دینی
وغیرہ۔“ زیل کے لیوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”اللہ اسے خوش رکھے۔“ بی بی اماں نے دعا
دی اور تخت پر پڑا اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگیں۔ جو
اون کے پچھوں اور گولوں پر مشتمل تھا۔

”سارے جہان کے کام کرنے اور انہیں
سمجھانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ تم نے تو اس زین کو
کیوں نہیں سمجھاتی ہو۔“

”کیا۔ کیا سمجھاؤں بی بی اماں۔“ وہ حیران سی
ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

”یہ ہی کہ اب باپ سے ناراضی ختم کرے۔“

تقریباً دو ماہ رہ کر جا رہے ہیں ظفریاب، بھی جو باپ
سے جڑ کر بیٹھا ہو۔ سودھ سکھ کہنے والے ہوتے ہیں۔
اکھوتا بیٹا ہے۔ ایسا کیا گناہ کر دیا ظفریاب نے شادی
کر کے، نہ کرتا شادی تو وہی حال ہوتا جو تیرے ابا کا
ہے۔ چپ لگ جاتی اسے بھی یہ تو عارفہ نے سنبھال لیا
اسے۔ ورنہ جینے کی امنگ ختم کر بیٹھا تھا۔ کہتا تھا۔ بی
بی اماں صوبی کے جانے کے بعد اب جینے کو جی نہیں
چاہتا۔ یہ ظفریاب بھی بس جلسوں جلسوں میں ہی

تقریریں کر سکتا تھا یہ نہیں کہ ایک تھپڑ لگا کر گلے سے لگا لے اور پوچھے کان پکڑ کر کہ صاحبزادے کیا ناقابل معافی قصور سرزد ہو گیا ہے مجھ سے کہ ابھی تک ایشیے ہوئے ہو۔“

بی بی اماں کبھی جب بولنے برآتی تھیں، تو ایسے ہی بولتی چلی جاتی تھیں کہ انہیں اس گھر کے ہر فرد سے بہت محبت تھی۔ ظفریاب کو اداس اور حسرت سے آئین کی طرف دیکھتے پا کر، ان کا دل ان کے لیے کڑھتا تھا۔

urdushehar.com

”کتنا شوخ، پر جوش اور غصیللا ہوتا تھا ظفریاب اب سارا دن باپ کے کمرے میں چپ بیٹھا رہتا ہے۔ مجھے تو تب سے طرح طرح کے وہم ستارے ہیں۔ جب سے ظفریاب نے بڑے صاحب سے کہا ہے کہ جانے سے پہلے وہ مکان میں اور مارکیٹ میں اپنا حصہ آئین کے نام کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔ لندن والا گھر بیوی اور بیٹی کے نام کر دیں گے۔ اور یہاں کی جائیداد زین کے کہ یو کے جانے سے تو اس نے انکار کر دیا تو میرے جانے سے پہلے کاغذی کارروائی ہو جائے تو کچھا ہے۔ یہ زندگی کے میلے میں زل! کیا خبر پھر بھی ملاقات ہونہ ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ جیتے جی باپ کے گلے لگ جائے۔“

”اللہ نہ کرے کہ کسی کو کچھ ہو۔ ایسا تو نہ کہیں بی بی اماں۔“ زل نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”اللہ ظفر چاچو کو لمبی زندگی دے۔“ وہ پہلے ظفریاب کو بتایا کہہ کر بلاتی تھی لیکن اس بار وہ انہیں چاچو کہنے لگی تھی۔

”خدا نخواستہ میرا کچھ ایسا مطلب نہیں تھا اللہ ظفریاب کو لمبی حیاتی دے۔ میں نے تو یونہی کہا دینی بات کی ہے۔“ وہ اپنا شاپراٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ظفریاب کی بیوی یا زلی (بری) نہیں ہے۔ بہن بھی آگے پیچھے ہی پھرتی رہتی ہے زین کے۔

”یہ تو ہے بی بی اماں! عارفہ آنٹی بہت اچھی ہیں اور ثناء تو بہت محبت کرنی ہے زین سے۔ لیکن بی

بی اماں آپ ہی بتائیں کیسے سمجھاؤں زین کو۔ کچھ کہوں گی تو مجھ سے ہی خفا ہو جائے گا۔ کئی دن تک بات ہی نہیں کرے گا۔ جانتی ہیں آپ اسے۔ آج کل تو ویسے ہی موڈ خراب رہتا ہے اس کا۔“ زل کو ڈر تھا کہ وہ کوئی بات کرے گی زین سے، تو وہ خفا ہو جائے گا۔

”ارے جانتی ہوں سب، کیوں ہر وقت تیوریاں چڑھائے رکھتا ہے۔ چلا جائے گا ظفریاب بھی تین چار دن میں پھر خود ہی موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔“ بی بی اماں کو زین پر بہت غصہ تھا بلکہ وہ دل ہی دل میں اس سے کچھ خفا ہی تھیں۔

یہ ویسے کے چند دن بعد کی بات تھی سب لوگ جہاں زیب بیگ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اختر بانو اور اماں کو صبح واپس جانا تھا۔ ثوبان شاہ زیحان اور نعمان اور شایان کے ساتھ ویسے اٹینڈ کر کے چلے گئے تھے، جبکہ سب کے اصرار پر اختر بانو اور اماں کو چند دنوں کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے کمرے میں آج کل اضافی کرسیاں رکھوا دی تھیں کہ قارغ ہو کر سب جہاں زیب بیگ کے کمرے میں ہی بیٹھتے تھے۔ وہ تہوہ لے کر آئی تھی تو انہوں نے سنا جہاں زیب بیگ ظفریاب سے کہہ رہے تھے۔

”میرا ارادہ ہے کہ جیسے ہی زل کے پیپر ختم ہوتے ہیں میں زل اور آئین کی شادی کر دوں کیا تمہارے لیے دوبارہ چند ماہ بعد آنا ممکن ہوگا۔“

”کیوں نہیں ابا جان، ہم آجائیں گے۔“ ظفریاب نے اختر بانو کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے آئین کی طرف دیکھا تھا، جو نگاہیں گود میں رکھے اخبار پر جمائے بیٹھا تھا۔

”سچ دادا جان! بھائی کی شادی ہوگی، میں مہندی پڑویا ہی ڈریس بنواؤں گی جیسا سحرش آپا اور مہرین آپا نے پہنا تھا۔“ ثناء بے حد خوش ہوئی تھی اور آئین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیوں نہیں۔“ جہاں زیب بیگ مسکرائے تھے۔

”جیسا دل چاہے بھائی کی شادی میں کپڑے

ڈالتا۔“

”لیکن ابا جان! جون میں تو بہت گرمی ہوگی۔“
 اتر بانو کو پتا تھا کہ زل جون تک فارغ ہوگی۔

”آگے پیچھے کہیں کر لیں، ستمبر اکتوبر یا پھر مارچ
 اپریل میں موسم اچھا ہوگا تب اور اگر مارچ اپریل میں
 بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ پیپر دیتی رہے
 گی۔ شادی کے بعد۔ کون سا زل نے نہیں اور جانا
 ہے۔ اسی گھر میں تو ہوگی۔“

”لیکن دادا جان! میں ابھی سال دو سال تک
 شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

آزین نے اخبار سے سر اٹھایا تھا۔

”لیکن کیوں۔“ جہاں زیب بیگ ہی نہیں بی
 بی اماں بھی حیران ہوئی تھیں، جن کے سامنے رخصتی کی
 رٹ لگائے رکھتا تھا۔

”میری ابھی جاب اشارٹ ہوئی ہے اور مجھے
 ہی سیٹل میں ہونے میں وقت لگے گا۔ اس سے پہلے
 میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

”لیکن تمہارے سیٹل ہونے تک ہم نہ رہے
 نہ۔“ جہاں زیب بیگ افسردہ ہو گئے تھے۔

”تم میرے ساتھ چلو زین! وہاں تمہیں اچھی
 جاب مل جائے گی اور اگر جاب نہ کرنا چاہو تو میرا
 سٹور سنبھال لو۔ تمہارے پاس برٹش پاسپورٹ
 ہے۔“

ظفریاب امید بھری نظروں سے اسے دیکھ
 رہے تھے۔ صبحی کے ہوتے ہی اس کا برٹش
 پاسپورٹ بن چکا تھا کہ صبحی خود برٹش سیٹل بھی اس
 کی پیدائش یو کے کی تھی۔ وہ جہاں زیب کے اصرار پر
 پاسپورٹ رینیو کروانا رہتا تھا، اس کے لیے وہاں جانا
 کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ جانا ہی نہیں چاہتا تھا سو
 ٹکار کر دیا۔

”تھینک یو، مجھے پو کے جانے اور آپ کا اسٹور
 سنبھالنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کسی قسم
 کی آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ جب میں سمجھوں گا

کہ بیوی بچوں کا بوجھ خود اٹھا سکتا ہوں تو رخصتی
 کروالوں گا۔“

ظفریاب کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں
 دھندلی سی ہو گئی تھیں اور تب سے ہی بی بی اماں کو
 آزین پر تب چڑھی ہوئی تھی۔

”کیا سوچتے ہوں گے ظفر کہ یہ تربیت کی ہے
 بی بی اماں نے ان کے بیٹے کی اور یہ سکھایا ہے جسے
 جاتے ہوئے وہ ان کے سپرد کر کے گئے تھے۔“

”آپ نے بتایا نہیں بی بی اماں! کسے
 سمجھاؤں۔“ زل نے پوچھا تو انہوں نے چونک کر
 اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بتاؤں۔“ ان کے لہجے میں ٹھکن سی اتر
 آئی تھی۔ ”پتا نہیں کتنا غصہ ہے اس کے اندر جو ختم ہی
 نہیں ہو رہا۔ لڑکیوں کو اتنی ادا میں آتی ہیں۔ منکوحہ ہو
 اس کی۔ اپنی ایک بات تک نہیں منوا سکتی بس اپنی
 اماں کی طرح ہی رہیں بدھو اور سادا۔“
 اور زل کو ہسی آ گئی۔

”آپ بھی نا بی بی اماں! کیسی باتیں کرتی
 ہیں۔“

”ارے غلط نہیں کرتی بات۔ خیر بڑے
 صاحب کی چائے کا وقت ہو چلا ہے تمہارے لیے بھی
 بنادوں۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اشار پر واپس تخت پر
 رکھ دیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب ہی صحن کا
 دروازہ کھلا، سحرش اور مرضی اندر داخل ہوئے۔ مرضی
 آج کل ڈیوڑھی والی میٹریوں کے بجائے اوپر نیچے
 آنے جانے کے لیے، صحن والی میٹریاں ہی استعمال
 کرتا تھا۔ سحرش میٹریوں کی طرف جانے کے بجائے
 برآمدے کی طرف بڑھی تھی۔ مرضی ارباب نے پہلے
 پوڑے پر قدم رکھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

”تو وہ بایک پر زین ہی تھا نا۔“
 ”جی زین بھائی ہی تھے۔“ سحرش اس کی بات
 سن کر حیران ہوئی تھی۔

”اور وہ اس کے پیچھے بیٹھی لڑکی، کیا تم اسے
 جانتی ہو۔ میں تو پہچان نہیں سکا ایک تو اس نے چادر

اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا اور دوسرے زین بھی بایک چلا نہیں اڑا رہا تھا۔ زن سے گزر گیا میں تو زین کو بھی ٹھیک سے پہچان نہ پایا تھا۔ بس شک گزرا تھا کہ زین ہے تب ہی تم سے پوچھا۔“ اس کے لبوں پر کہیں سی مسکراہٹ تھی، اب وہ پوری طرح برآمدے کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔

سحرش حیران کی مڑ کر اسے دیکھ رہی تھی پھر اس کے لبوں پر شرابی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”جی مرتضیٰ بھائی! آپ واقعی صبح سے پہچان نہیں سکے۔ زین بھائی تو اکیلے تھے البتہ وہ دوسری بایک جو ان کی بایک کے دائیں طرف سے تیزی سے گزری تھی، اس پر سیاہ چادر اوڑھے پیچھے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔“

اور مرتضیٰ کا جی چاہا کہ کھینچ کر ایک تھڑ مارے سحرش کو اب وہ ایسا اندھا بھی نہیں تھا کہ زین اور اس کے پیچھے بیٹھی لڑکی کو دیکھ نہ پاتا۔ کتنا اچھا موقع ملا تھا زل کو بدگمان کرنے کا۔ سحرش کی گواہی سے وہ ضرور آ زین سے بدگمان ہو جاتی۔ اصل مسئلہ تو ج ڈالنے کا ہی تھا، ایک بار وہ اس کے دل کی زمین میں بدگمانی کا ج ڈال دیتا تو پھر اسے پانی دینا اور نمونک پہنچانا مشکل نہ تھا۔

”لیکن یہ سحرش کی بچی۔“ اس نے دانت پیسے اور قدم صحن میں رکھا اور تیز تیز چلتا ہوا برآمدے کی دونوں میزٹیوں کو ایک ساتھ پھلانگتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ برآمدے کا فرش صحن سے اونچا تھا۔

”کیا میں تمہیں اندھا نظر آتا ہوں جو زین کے پیچھے بیٹھی لڑکی کو دیکھ نہ پاتا لیکن تمہاری نظر ضرور کمزور ہے۔ اپنی اس چشمہ ٹوپی کی طرح نظر کا چشمہ لگا لو۔“ اس کی آگ برسائی نظروں نے سحرش کو اندر سے ڈرا دیا لیکن وہ بھی سحرش ارباب تھی۔ اس نے کندھے اچکائے۔

”ہو سکتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو، دونوں بایک ہی تو اتنی تیز تیز پائن سے گزری تھیں۔“

مرتضیٰ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا گلابا دے۔ شادی میں کئی بار ایسے موقعے ملے تھے کہ کوئی سین کری ایٹ creat کر کے آ زین کو زل سے بدگمان کر دیتا لیکن یہ سحرش کی بچی بوتل کے جن کی طرح ہر موقع پر آن موجود ہوتی تھی۔ اور اب تو ج تھا۔

”کیا کہا مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔“ اسے گھورتا ہوا ایک قدم آگے اس کی طرف بڑھا تو وہ جلدی سے تخت پر زل کے پاس بیٹھ گئی۔ اور زل جو دھپسی سے دونوں گود دیکھ رہی تھی یک دم چوکی۔

”نہیں نہیں غلط فہمی آپ کو نہیں سحرش کو ہوئی ہے۔ زین اپنے ساتھ ماہوش کو لے کر گیا ہے بایک پر۔ دراصل مٹن فروٹ کاٹن کاٹے ہوئے بے دھمائی میں کٹا ہوا ڈھکن اس کی پھیلی میں لگ گیا تھا۔ زخم گہرا تھا اور خون بھی نہیں رک رہا تھا اس لیے زین اسے ڈسپنری لے کر گیا ہے۔ اور تو کوئی گھر میں تھا نہیں تو۔“

”ہمیشہ تم ہی ٹھیک نہیں ہوتی ہو سحرش۔“ وہ ایک جتنی ہوئی نظر اس پر ڈالتا تیز تیز چلتا ہوا صحن عبور کر کے میزٹیوں پر اس طرح چڑھنے لگا کہ اس کے قدموں کی دھمک برآمدے تک آ رہی تھی۔ اب ہا نہیں اسے خجالت ہو رہی تھی یا اپنی کوشش کی ناکامی پر غصہ تھا لیکن وہ سحرش کی کلاس لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ زل تو شاید بھی بھی آ زین سے بدگمان نہ ہوتی اور اگر ہو بھی جاتی تو اس کا کوئی خاص فائدہ اسے نہیں پہنچے والا تھا۔ لیکن آ زین آسان ٹارگٹ تھا کہ صبحی کے چلے جانے کی وجہ سے وہ اعتبار کھو چکا تھا اور اسے اب صرف اور صرف آ زین پر کام کرنا تھا اور اس دن کا انتظار جب آ زین غصے میں آ کر زل کو طلاق دے۔ وہ ایسا کر سکتا تھا وہ بچپن سے اسے جانتا تھا۔ جب بھی اسے غصہ آتا تھا تو اکثر اپنا ہی نقصان کر بیٹھتا تھا۔ اس کے میزٹیوں سے او جھل ہوتے ہی سحرش نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا اور زل کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

”ارے کبھی سنی ہوں ناتم نے ان کی لن ترانیاں
- دودو گولیاں کھائی پڑیں۔ قسم سے سر پھٹنے لگتا ہے درد
سے۔ آہ میری نازک احساسات رکھنے والی آرٹسٹ
مانڈو، ادب کی دلدادہ بے چاری کزن کہاں پھنس
گئی۔ زہر لگتا ہے مجھے وہ کھڑوس سا۔“ جب کوئی بندہ
اسے پسند نہیں آتا تھا تو وہ ادب آداب سب بھول
جاتی تھی۔

”دعا کرو زل! وہ شوخا، گپ باز کھانے تک نہ
رکے۔ ایسی عجیب نظروں سے دیکھتا ہے جیسے نظروں
ہی نظروں میں ایک سرے کرزہا ہو سب کے۔ خاص کر
لڑکیوں کے۔ اور یوں اکڑ کر بیٹھتا ہے جیسے فرعون
بیٹھتا ہوگا۔ اس روز شاہ رخ بھائی نے مصلحتی کے
لیے ہاتھ بڑھایا تو دو انگلیوں سے کچ کر کے چھوڑ دیا
جیسے سب غلام ہوں اس کے ویسے، آپس کی بات ہے
یہ عقل کی صورت میں فرعون نے ہی تو دوبارہ جنم لیا
لیا۔“ وہ ہولے سے ہنسی تو زل بھی مسکرا دی۔

”ویسے یہ تمہارے والے ایگری بیگ مین کا
منہ کیوں ہو جا ہوا ہے۔ آج کل کیا ظفر چاچو اور آنٹی
کی وجہ سے۔ ویسے مجھے تو ثنا اور آنٹی بہت اچھی لگی
ہیں۔ اور میں نے دل ہی دل میں پروگرام بھی بنالیا
ہے کہ رخسانہ خالہ سے کہتی ہوں کہ بلال کے لیے
چاچو سے بات کر لیں۔ دودو قاندے، ایک تو اتنی
پیاری لڑکی مل جائے گی کہ انوسٹ سی اور جھونگے
میں برٹش پاسپورٹ بھی مل ہی جائے گا۔ تم نے دیکھا
نہیں تھا۔ دور نزدیک کے رشتہ دار لڑکے سب ثناء کے
ارڈر دی گھوم رہے تھے کہ شاید وال گل جائے۔ لیکن
یہ بلال بے وقوف گدھا اسے ذرا بھی عقل نہیں کہ اپنا
ٹانکا بھی لگا لے بس پھر بھلا کس کو کیا اعتراض ہوتا
میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ ثنا بھی بس
پوچھتی سی ہے۔“ وہ ایسے ہی بے لاگ تبصرے کرتی
تھی۔

”ویسے ملی! ایک بات تو بتاؤ یہ انگلیڈ
اور امریکہ پلٹ بچے اتنے بے وقوف اور سادا سے
کیوں ہوتے ہیں، ہمارے جیسی چالاکیاں

وہ اپنی کسی غلط یا صحیح بات پر کبھی شرمندہ نہیں
ہوتی تھی، بس جو اس کے دل میں آتا تھا کہہ دیتی تھی،
سے پروا نہیں ہوتی تھی کہ اس کی بات کا رد عمل
دوسرے پر کیا ہوا ہے بقول مہرین کے وہ اپنی قسم کا
واحد بیٹس تھی، جو ارباب بیگ کے ہاں وارد ہوا تھا۔

”تم تو اپنی دوست کے گھر گئی تھیں۔ اتنی جلدی
واپس آ گئیں۔“

زل کو سحرش پر پیارا رہا تھا کئی بار اس نے ٹوٹ
کیا تھا کہ یہ لا ابالی سی سحرش، کوشش کرتی ہے کہ وہ
بین سے بدگمان نہ ہو۔ بھلے اس کے لیے اسے
بھوٹ ہی کیوں نہ بولنا پڑے۔ اس کی ان چھوٹی
بھوٹی بے ضرر کوششوں نے زل کے دل میں اس کے
لیے ایک خاص جگہ بنا دی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس
کی یہ ساری کوششیں زل کے لیے نہیں مہرین کے
لیے تھیں۔

”وہ گھر پر نہیں تھی، اپنی ٹانگوں کے گھر گئی ہوئی
غلطی میری تھی میں جانے سے پہلے فون کر کے
چھ لیتی۔ اتنے دنوں سے بلا رہی تھی کہ گپ شپ
کا میں گے اور مجھے اس کی ممکن کی تصویریں بھی دیکھنی
تھیں۔ خیر۔“ وہ کندھے اچکا کر سیڑھیوں کی طرف
یکھنے لگی پھر جیسے اچانک اسے ماہوش کا خیال آیا۔

”یہ ماہوش بیگم کو کیا ہوا تھا کہ صبح صبح کس فروٹ
کاشن کاٹنے بیٹھ گئیں۔ اتنا ٹھونس کر تو ناشتہ کیا تھا۔“

”شاید کوئی ڈیزرٹ بنانا تھا اسے۔ رات کو
نازہ اور عقل بھائی آ رہے ہیں، کل یا پرسوں انہیں
ہی جانا ہے تو تائی جان کہہ رہی تھیں کہ اب آئیں
گے تو کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ ایسے تھوڑے ہی
بانے دیں گے۔“ زل نے بتایا۔

”ہاں اگر وہ سڑیل مزاج عقل بھائی راضی ہو
گئے کھانے کے لیے رکنے پر تو۔ ویسے ایک سرور دی
گولی ہے تو دے دینا رات کو ضرورت پڑ سکتی
ہے۔“ سحرش نے براہِ سامنے بتایا۔

”کیا اب مستقبل کی خبر بھی ہونے لگی ہے
نہیں۔“ زل مسکرائی۔

اور ہوشیاریاں انہیں کیوں نہیں آتیں۔ میری طرح
سچے کھرے۔“ اس نے گردن اٹھائی تو زبل کو ہنسی آ
گئی۔

”نہا نہیں لیکن سب ایسے نہیں ہوتے۔ ویسے تم بڑی لگی ہو ہر لحاظ سے سادا اور محسوم سی ایک نند جو ابھی سے صدقے واری ہو رہی ہے۔ بھولی بھالی سی اللہ میاں بھگی گائے ساس، ہاں زین تھوڑا سا کڑوا ہے لیکن جہاں اتنی مٹھاس ہو وہاں تھوڑی سی کڑواہٹ برداشت کر لینی چاہیے بیلنس رہتا ہے۔“

کب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور زین کے ساتھ ماہ
وین اندر لائی۔ سحرش پک دم کھڑی ہو گئی۔

”کیا زخم زیادہ گہرا تو نہیں تھا اسچڑ لگے۔“
”ہاں دوا اسچڑ لگے ہیں۔“ ماہوش کے چہرے

سے لگ رہا تھا کہ اسے ابھی کبھی تکلیف ہو رہی ہے۔
 ”ہاں اب تم اپنا ہاتھ لے کر بیٹھ جانا ظاہر ہے
 اس زخمی ہاتھ کے ساتھ تم سے کام تو نہیں ہوگا۔ سب
 مجھے اور میری کو بھی کرنا پڑے گا۔ یہ ہی، تھکنڈے ہوتے
 ہیں بھائیوں کے، مندوں نے گھر آنا ہو تو یوں ہی کسی
 نہ کسی بہانے سے کام سے جان چھڑا لیتی ہیں۔“ اس
 کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”یکومت۔“ ماہوش نے اسے گھورا۔
 ”میں تو اماں کی بات سننے لگی تھی بے دھیانی
 میں کئے ہوئے حصے پر ہاتھ لگ گیا۔“
 ”مجھے بتا دینا کوئی کام ہو تو۔“ زل نے آفر کی تو
 سحرش کھل اٹھی۔

”نیکو اور پوچھ پوچھ۔ اماں سے پوچھ کر بتاؤں گی کہ کیا مدد چاہیے۔“ وہ مسکراتی ہوئی ماہوش کے ساتھ میزھیوں کی طرف بڑھ گئی تو زمل نے خاموش کھڑے آئین کی طرف دیکھا۔

”کیا سوچ رہے ہو زین! بیٹھ جاؤ نا۔ کتنے سارے دن ہو گئے ہیں سکون اور فراغت سے بیٹھ کر بات کئے ہوئے۔“

”نہیں پہلے تم خدمت خلق کرو پھر ریاست کر لیں گے ہم بھی۔“ وہ ناراض ناراض سا کرسی سے اٹھ کر بیٹھ

گیا۔ ”اتنے خفا اور ناراض مت رہا کرو زین! بہا تو ہے تمہیں، شادی، مہمان نوازی، دعوتیں۔ اتنی مصروفیات تھیں کہ فراغت ہی نہیں ملتی تھی۔ پھر یونیورسٹی جانا، آنا۔ ٹھیک سے پڑھائی بھی نہیں ہو پارہی تھی تم بتاؤ تمہاری جاب کیسی جارہی ہے۔“

”اچھی ہے۔ سیکری بھی اچھی ہے لوگ بھی اچھے ہیں۔“ وہ یوں ہی ناراض ناراض سا بولا تھا۔

”آج کیا آفس نہیں جانا تھا۔ چھٹی ہے۔“
 زمل اس سے بات کرنا چاہتی تھی اسے لگتا تھا جیسے ان
 بے حد مصروف شب و روز میں ان کے درمیان
 اجنبیت سی در آئی تھی۔

”نہیں خود چھٹی لی ہے چچا جان کو سیشن کے لیے لے کر جانا ہے۔ شیخو بابا تو آج بتایا جان کے ساتھ فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔ دادا جان نے شاید ان سے بات کی تھی کہ شیخو بابا کو کارخانے میں لگا لیں اور کام سیکھ جائیں تو اچھی اور مناسب تنخواہ دیں انہیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے زین۔“ وہ خوش ہو گئی تھی۔

”ہاں شاید دادا جان نے ظفر چاچو سے بھی بات کی ہے، تب ہی انہوں نے ان سے کہا ہے کہ واپس جا کر وہ رقم بھجوا میں گے تو دکانوں کے اوپر قسٹ بنوالیس شیخو بابا کے لیے۔ دادا جان میری بات کبھی نہیں بھولتے۔“

”ہوں۔“ وہ سیاٹ چہرہ لیے تخت پر پڑی اس کی کتابوں کو دیکھ رہا تھا۔ ظفریاب کے ذکر پر اس کے تاثرات یوں ہی سیاٹ ہو جاتے تھے۔

”زین! تم ظفر چاچو سے اپنی ناراضی ختم کر دو اب۔“ زل کو یاد تھا کہ بی بی اماں نے اسے زین کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔

کیوں نہیں کرتے ان سے۔“

ہے۔ اچھی لگتی ہے مجھے بھی۔ لیکن ہم دوسری بار ملے ہیں۔ پہلی بار جب وہ آئی تھی تو چھوٹی سی تھی تو ہمارے درمیان بے تکلفی کیسے ہو سکتی ہے۔“ آ زین نے اس کی بات دھیان سے سنی تھی، زل کو خوشی ہوئی تھی۔

”کیا بات کروں میں ان سے ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے جس پر بات کروں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”پتا ہے زین! ثنا مجھ سے تمہارے متعلق پوچھتی ہے کہ تم کیسے ہو۔ خوش اخلاق نرم دل..... سخت مزاج۔“

”بی بی اماں کہتی ہیں سودکھ سکھ ہوتے ہیں کہنے والے۔“ زل نے اس کی طرف دیکھا۔

”اور تم نے کیا بتایا کہ میں کیسا ہوں۔“ وہ جو ڈل سا بیٹھا تھا یک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔

”میں جب ان کے سینے میں سر چھپا کر رونا چاہتا تھا تو وہ میرے پاس نہیں تھے۔ جب میں اسکول میں کوئی انعام جیتنے پر کلاس میں فرسٹ آنے پر اپنی خوشی ان سے شیئر کرنا چاہتا تھا تو وہ نہیں تھے۔

”ظاہر ہے جیسے ہو ویسا ہی بتایا۔“ زل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”بس مریم چاہتی تھیں، دادا جان تھے اور بی بی اماں۔ میں اپنی خوشیاں اور دکھ اپنے اندر ہی دفن کرتا آیا ہوں تو اب کیا کہوں ان سے۔“

”مجھے نہیں پتا کہ میں کیسا ہوں تم بتاؤ نا، میں کیسا ہوں۔ کیا کہا تھا تم نے ثنا سے۔“ وہ اب بے حد دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

زل چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

”میں نے کہا بہت اچھا، نرم دل، ہمدرد سب کا خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا اس جیسا اور کوئی نہیں۔“ زل کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ زین کو صحن میں پھیلی اور برآمدے میں بکھری دھوپ جو کچھ دیر پہلے آنکھوں میں چھ رہی تھی، اچھی لگنے لگی تھی۔ فضا میں اسے ایک خوش گوار سا احساس بکھرا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”پھر بھی تم ان کے پاس بیٹھا کرو۔ کوئی نہ کوئی بات نکل ہی آئے گی کرنے کے لیے۔ اکلوتے بیٹے ہو ان کے جی چاہتا ہو گا ان کا کہ تم ان کے پاس بیٹھو یا تمیں کرو۔ پھر ثنا تمہاری بہن ہے کیا وہ بھی اچھی نہیں لگتی سمجھیں۔ بہنیں تو بھائیوں کو بہت پیاری ہوتی ہیں۔ بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔“ زل نے سوچا تھا کہ وہ آج زین کا دل نرم کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

”کیا واقعی تم نے ثنا سے یہ کہا۔“

”ہاں تو بھلا اس میں جھوٹ کیا ہے۔ تم واقعی بہت اچھے ہو زین۔ سب کا احساس کرنے والے سب سے محبت کرنے والے۔“

”اچھا۔“ وہ یک دم چونکا۔

”وہ جتنی دیر میرے پاس بیٹھتی ہے تمہارے متعلق ہی باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ تم سے ڈھیروں باتیں کرے گی اور اپنی دلچسپیاں شوق تمہیں بتائے گی تم سے تمہارے شوق، دلچسپیاں پوچھے گی۔ لیکن تم اتنے سنجیدہ اور خاموش رہتے ہو کہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی تم سے بات کرنے کی۔“

”ذرا میری طرف تو دیکھو۔ یہ سبق تمہیں سحرش نے تو نہیں پڑھایا کہ کبھی کبھی اپنے ہونے والے شوہر محترم کی تعریف کر دیا کرو۔“

”حالانکہ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ تم سے فرمائش کرے تم اس کے لاڈ اٹھاؤ۔ تم اس کے بھائی ہو اس کے لیے وہ خود کو لگی کہتی ہے۔“

”نہیں بھلا وہ مجھے کیوں کچھ سکھائے گی، کیا میں تمہیں نہیں جانتی کہ تم کیسے ہو۔ بلکہ میں تو تمہیں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”وہ مجھے بری کیوں لگے گی زل! میری بہن

”دراصل چند دن پہلے وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ کبھی کبھی ہونے والی بیوی کو دو چار لفظ اظہار کے بھی دان کر دیا کریں کہ اپنے مرد کے منہ سے نکلے ہوئے یہ چند لفظ I love you (آئی لویو) اسے مہینوں شانت رکھتے ہیں۔“

”ضرور اس نے یہ کسی کہانی سے پڑھا ہوگا۔“
مہم سی مسکراہٹ زل کے لبوں پر نمودار ہوئی۔
”اس نے مجھے اس طرح کی کوئی نصیحت نہیں کی لیکن اپنی ڈائری سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا تھا مجھے کہ بھی بھی ایک دوسرے کو آئی لویو کہہ کر تجدید کرتے رہنا چاہیے۔“

”ہاں تو پھر کرونا تجدید۔ آئی لویو۔۔۔۔۔ کہہ کر۔“
آزین کی آنکھوں میں شوخی تھی۔
”کیا ہمیں یہ کہنے کی ضرورت ہے زین۔“
زل لمحہ بھر کو سنجیدہ ہوئی۔

”کیا ہم نہیں جانتے۔“
”ہاں، لیکن وہ سحرش تو کہتی ہے نا تجدید بہت ضروری ہے ورنہ محبت میں دراڑ پیدا ہو جاتی ہے۔“ وہ اس طرح شوخی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”یہ سحرش بھی نا۔“ زل بے اختیار ہنس دی۔

اس کے خوب صورت ہونٹوں اور چمک دار دانتوں نے روشنی سی بکھیر دی تھی وہ مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”تمہاری ہنسی بہت خوب صورت ہے۔ میں نے آج تک ایسی ہنسی کسی کی نہیں دیکھی جو روشنی سی بکھیر دے اور کانوں میں جلتنگ سا بجتے لگے۔ کیا ہنسی کی تعریف کی تجدید کرنے کو بھی سحرش نے کہا تھا۔“

زل کے ہونٹ ابھی بھی کھلے ہوئے تھے۔
آنکھوں میں حیا کے رنگوں کی جھلک سی تھی اور ان رنگوں کا عکس جیسے اس کے رخساروں پر بھی پڑتا تھا کہ وہاں بھی شفق سی بکھری تھی۔

”نہیں یہ میرا دل کہتا ہے کہ جب بھی تم یوں بے اختیار ہو کر ہستی ہو تو میں اعتراف کروں تمہاری

ہنسی بہت خوب صورت ہے۔“
وہ کرسی کی ہتھکڑی پر ہنسی ٹکائے تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ زل کی پلکیں جھک گئیں۔ اس نے کئی بار اس کی ہنسی کی تعریف کی تھی۔ آنکھوں میں بے حد اشتیاق لیے وہ کتنے دنوں بعد یوں اس طرح جذب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہیزل براؤن آنکھیں محبت کی کرنوں سے لبریز تھیں۔ برف پھل رہی تھی۔
”تو کیا صرف میری ہنسی خوب صورت ہے۔ میں نہیں۔“ زل نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر شرارت سے اسے دیکھا۔

”صرف تمہاری ہنسی نہیں زل، تمہاری ذات کے سارے موسم، تمہارا بولنا سب کے کام آتا، ہر ایک کا خیال رکھنا۔ تمہارا چلنا، تمہاری پلکوں کا اٹھنا اور گرنا، تمہاری مسکراہٹ، تمہارے چہرے پر بکھری یہ رنگوں کی برسات میں سب کا دیوانہ ہوں اور خاص طور پر تمہارا۔ یہ خوب صورت انمول، نایاب دل جس میں سب کے لیے احساس، محبت اور خلوص ہے۔“ اس طرح کا اظہار تو اس نے آج سے پہلے بھی نہیں کیا تھا۔ زل کا دل معمول سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”پتا ہے ملی، ان گزرے دنوں میں جب تم ضرورت سے زیادہ مصروف تھیں تو بھی مجھے لگنے لگتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہیں۔ جیسے میں تمہارے لیے اہم نہیں بس تمہارے کام تمہارے لیے اہم ہیں۔“

”ایسا کچھ نہیں تھا زین! یہ تمہارے اپنے وہم تھے۔ مصروفیت ہی بے تحاشا تھی۔ شکر ہے شانزے کے سسرال والوں کی دعوت بھی ہو گئی۔ چاچو بھی دو دن تک چلے جائیں گے تو پھر ساری مصروفیت ختم ہو جائے گی لیکن میرا دل تو ابھی سے اداس ہو رہا ہے۔ چاچو اور ثناء وغیرہ کی وجہ سے کتنی رونق ہے۔ گھر بھر انجرا سا لگتا ہے۔ اب چلے جائیں گے تو کیسی بے رونق سی ہو جائے گی نا زین۔“ آزین کچھ نہیں بولا تو لمحہ بھر بعد زل نے پوچھا۔

”زین تم چاچو کو ایئر پورٹ چھوڑنے جاؤ گے نا۔“
 ”میں کیا کروں گا جا کر۔“ اس کی سوالیہ نظریں
 زل کی طرف اٹھیں۔
 ”بھگڑا ڈالنا جا کر۔“ وہ جل کر بولی تو وہ ہنس
 دیا۔

”ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو بھگڑا ڈالنے چلا جاؤں
 گا ایئر پورٹ پر۔“
 ”تم انہیں سی آف کرنے جاؤ گے تو وہ خوش ہو
 جائیں گے۔ تم انہیں لینے بھی تو نہیں گئے تھے تو۔ اب
 چلے جانا۔“ وہ سنجیدہ مگی۔
 ”کیا انہوں نے بھی میری خوشی کا خیال کیا، جو
 میں ان کی خوشی کے لیے احمقوں کی طرح رخصت
 کرنے چلا جاؤں۔ بچے تو نہیں ہیں نا کیسی پر چلے
 جائیں گے۔“ وہ یوں ہی اچانک رخ ہو جاتا تھا۔ زل
 نے تاسف سے اسے دیکھا۔
 ”اچھا چلا جاؤں گا، نا اب اس طرح تو نہ
 دیکھو۔“

اسے احساس ہوا تھا کہ زل کو اس کی بات سے
 دکھ ہوا ہے۔
 ”اب ان کی سزا ختم کر دو زین!“ زل کو پھر
 خیال آیا تھا کہ بی بی اماں نے اسے زین کو سمجھانے
 کے لیے کہا تھا۔

”کیسی سزا زل! انہیں بیوی مل گئی ہے۔ شاید
 پہلی بیوی سے زیادہ خوب صورت اور اچھی۔ لیکن
 مجھے تو ماں نہیں ملی۔ سزا تو میں کاٹ رہا ہوں ملی۔“ وہ
 بے حد افسردہ سا تھا۔ اس نے ماتھے پر آئے سلی
 بالوں کو دائیں ہاتھ سے پیچھے کیا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ زل چاہتی ہے کہ اس کے اور
 ظفریاب کے درمیان جو سرد مہری ہے وہ ختم ہو
 جائے۔ وہ خود بھی اجنبیت کی اس دیوار کو گرا دینا چاہتا
 تھا لیکن کوئی تکلیف وہ احساس اسے ان کی طرف
 بڑھنے سے روک دیتا تھا۔ زل افسردہ سی اس کی
 طرف دیکھ رہی تھی۔ آ زین کی ایسی باتیں اسے ہمیشہ

دکھی کر دیتی تھیں۔ وہ آواز ہو جاتی تھی اور وہ دل ہی
 دل میں عہد کرتا تھا کہ اب بھی زل کے سامنے، ایسی
 بات نہیں کرے گا لیکن پھر کچھ نہ کچھ کہہ بیٹھتا۔
 ”زل۔“ وہ ابھی تک کرسی کی ہتھکی پر کہنی
 لکائے تھوڑا سا آگے کو جھکا ہوا تھا۔

”میں تمہاری محبت، دوستی اور خلوص پر نازاں
 ہوں۔ تم کیسے میری ذات کے گرد چھائے اداسی کے
 بادلوں کو ہٹا دیتی ہو۔ تم میرے آسمان پر چمکنے والا
 سب سے روشن ستارہ ہو زل آئی لو یو۔ اب تم بھی تو
 کہہ دو لگتا ہے سحرش کی فصاحت کا تم پر کوئی اثر نہیں
 ہوا۔“

وہ مسکرایا۔ ”آئی لو یو زین۔“ وہ مسکرائی۔ وہ
 جانتی تھی ایسا کہنا ضروری نہیں لیکن پھر بھی وہ چاہتا تھا
 وہ کہے تو اس نے کہہ دیا تھا۔

”تھینک یو زل۔“ وہ سیدھا ہو گیا۔ لیکن نگاہیں
 اب بھی اس پر تھیں۔ محبت لٹالی ٹار ہوئی نگاہیں۔
 ”زین۔“ اس کے اس طرح دیکھنے سے کھبرا کر
 زل نے اسے مخاطب کیا۔

”تمہیں پتا ہے نا میں نے آج مارکیٹ جانے
 کے لیے چھٹی کی ہے۔ تو تم بھی گھر ہو تو بی بی اماں کے
 بجائے تم ساتھ چلے چلنا۔ مجھے پتا اور آنٹی کے لیے
 گفٹ خریدنا ہے۔ ویسے تو تمہیں بھی کچھ گفٹ لینا
 چاہیے چھوٹی بہن کے لیے۔“

”او کے میم۔۔۔۔۔ جو حکم۔“ اس نے سر خم کیا۔ اس
 کی آنکھوں میں اب وہی نرمی اور خلوص کی جگہ گھٹ
 بھی جو ہمیشہ ہوتی تھی۔ سرد مہری کی برف پگھل گئی
 تھی۔

”میں ڈاکٹر ارسلان کی طرف سے واپس آتا
 ہوں تو چلتے ہیں تم تیار رہنا بلکہ مجھے پہلی تنخواہ ملی ہے
 کل تو سب کے لیے گفٹ لینے ہیں مجھے۔“

تب ہی جہاں زیب اپنے کمرے سے باہر نکل
 کر ان کی طرف آئے۔
 ”زیبی کو آج ڈاکٹر کی طرف جانا تھا تو کب
 تک جانا ہے۔“

”بس دادا جان! آدھے پونے گھنٹے تک نکل جاتا ہوں۔“ اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

”میں دیکھوں چچا جان جاگ گئے ہوں تو انہیں جانے کا بتاؤں۔“

شاہ زیب اب ضد نہیں کرتے تھے خاموشی سے جانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ زیادہ تر شیخو بابا کے ساتھ جاتے تھے اور بھی کبھار زین لے جاتا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ بہتر تھے۔ تھوڑا بہت کھاپی بھی لیتے تھے۔ شادی کے ہنگامے کی وجہ سے کچھ ڈسٹرب رہے تھے لیکن پھر ڈاکٹر اریلان نے کچھ دواؤں کی ڈوز بڑھادی تھی کچھ کم کردی تھی تو اب پرسکون تھے۔

”ظفریاب کب تک واپس آئیں گے زمل! کچھ بتا کر گئے ہیں۔“ ظفریاب ناشتے کے بعد عارفہ اور ثناء کے ساتھ اپنے سسرال گئے ہوئے تھے۔

”عارفہ آئی کہہ رہی تھیں کہ لچ کر کے آئیں گے۔ بیٹھیں دادا جان، یہاں دھوپ کی ہلکی پیش ہے اچھی لگ رہی ہے۔ آپ کے کمرے میں تو ٹھنڈ ہے بہت۔“ اس نے اپنی کتابیں سمیٹ کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

”پڑھائی ہو رہی تھی۔“ وہ پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

”نہیں..... بس ارادہ تو تھا پڑھنے کا لیکن پھر دل ہی نہیں چاہا۔ ایسے ہی سکون سے بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ اور دادا جان! مجھے آج زین کے ساتھ مارکیٹ جانا ہے آپ مجھے بتا دیجئے گا کیا کیا لانا ہے۔“

”بس تینوں کے لیے سوٹ ہی لانے ہیں اچھے سے ریڈی میڈ ہی لینا۔ وہاں کہاں سے سلوائیں گے۔ زین اور ظفریاب کا ناپ ایک ہی ہے۔“ وہ عید سے پہلے ظفریاب کے لیے یہاں سے ہی کپڑے بھجواتے تھے۔

”بتاؤ عارفہ سے پوچھ لیا تھا ناپ وغیرہ۔“

”جی۔“

”ظفریاب کے لیے کچھ کتابیں بھی میں نے منتخب کر رکھی تھیں۔ اگر وقت مل گیا تو وہ بھی لیتے آنا۔ میں نے فہرست بنا دی تھی۔“

چاروں بھائیوں میں سے صرف ظفر ہی ایسے تھے جنہیں جہاں زیب بیک کی طرح کتابوں سے محبت تھی۔ بہت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ وہ۔

”جی دادا جان! ہمیں مال پر بھی جانا ہے وہاں سنگ میل سے جو مل سکیں وہ لے لیں گے۔“

”وقت بھی اتنی جلدی گزر جاتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی ظفریاب آئے تھے اور اب جانے کا وقت بھی آ گیا۔“ وہ بے حد دل گرفتہ اور افسردہ لگ رہے تھے۔

”تو دادا جان! آپ ان سے کہیں نا وہ یہاں ہی رہ جائیں۔ کتنی رونق سی ہو گئی ہے نا ان کے آنے سے۔“ اس نے جہاں زیب بیک کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”کیسے کہوں میں نے ہی تو اسے کہا تھا جانے کے لیے کہ موقع مل رہا ہے تو چلا جائے۔ وہ کب جانا چاہتا تھا۔ عارفہ کا بھائی تو اس کی شادی کے بعد سے ہی کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ وہاں چلے آئیں۔“ پہلی بار جہاں زیب بیک بتا رہے تھے۔

”صبوحی کے جاننے کے بعد کچھ سیاسی پارٹیاں اسے پھر اپروچ کرنے لگی تھیں پارٹیوں کی ضرورت ہوتے ہیں اس طرح کے جذباتی لوگ، جنہیں وہ قربانی کا بکرا بنا سکیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم پھر کسی ایسی صورت حال سے دوچار ہوں اور پھر ان دنوں میں نے کچھ مشکوک طرح کے لوگ اسے گھر کے آس پاس دیکھے تھے۔ وہ ظفریاب کے متعلق پوچھ رہے تھے تو بس پھر میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ یو۔ کے جا کر سیشن ہو جائے۔ عارفہ کے بھائی نے اسے وہاں سیٹ ہونے میں مدد دی تھی۔“

”آپ نے زین کو بھی بتایا کہ چچا جان سے آپ نے کہا تھا جانے کو۔“ وہ بھی انہیں چچا جان اور کبھی چاچو کہنے لگی تھی کہ اکثر کنفیوژن سا ہو جاتا تھا کہ

وہ کس کی بات کر رہی ہے ارباب تایا کی یا ظفریاب کی کہ وہ دونوں کو ہی چھوٹے تایا کہتی تھی۔ بی بی اماں نے ٹوکا بھی تھا کہ ظفر تمہارے تایا ہیں۔ تایا کہا کرو لیکن اسے چاچو یا چچا جان کہنا اچھا لگنے لگا تھا۔

”بتایا تھا لیکن شاید اس نے یقین نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں باپ کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔“ وہ کچن کی طرف دیکھنے لگے جدھر سے بی بی اماں چائے کے دو کپ چھوٹی ٹرے میں رکھے یا ہرنگلی تھیں اور پھر انہیں وہاں ہی بیٹھا دیکھ کر پوچھ رہی تھیں کہ وہ چائے ادھر ہی لے آئیں انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”مجھے لگتا ہے دادا جان، زین کے دل پر جی ناراضی کی برف پکھلنے لگی ہے۔ چچا جان بھی تو سالوں بعد آتے ہیں اگر ہر سال چھٹیوں میں وہ آیا کرتے تو یہ سرد مہری کی برف کب کی پکھل چکی ہوتی۔“ زل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

NOVELS LAND

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو زل! لیکن جب وہ پچھلی بار آیا تھا تو بہت مایوس ہو کر گیا تھا۔ زین تھا تھا بھائیوں کے پاس وقت نہیں تھا۔ یہ وہی بھائی تھے ظفریاب جن پر جان چھڑکتا تھا۔ اب بھی یہی حال ہے۔ ظفر نے کئی بار کہا ارباب سے کہ کسی روز جلدی کارخانے سے آجائیں تو کپ شپ لگائیں گے پرانے دوستوں سے اکٹھے ملنے جائیں گے۔ ظفر اور ارباب اوپر تلے کے تھے تو بہت دوستی تھی ان کی۔ لیکن اب دو دن رہ گئے ہیں اس کے جانے میں اور ارباب کارخانے سے آتا ہے تو تھکا ہوا ہوتا ہے۔ سلام کر کے اوپر چلا جاتا ہے۔ کون جانے دو بار زندگی میں ملاقات ہو یا نہ ہو۔“ آنکھوں میں نمی پھیل گئی جسے انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔

”ایسا ہی ہوتا ہے بڑے صاحب!“ بی بی اماں نے ٹرے تخت پر زل اور جہاں زیب بیگ کے درمیان رکھا۔

”ماں کے چوہے پر جب سب بہن بھائی

اکٹھے ہوتے ہیں تو بہت محبتیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں لیکن جب چوہے الگ ہوتے ہیں تو محبتیں بھی تقسیم ہو جاتی ہیں، یہ ہی دستور زمانہ ہے محبتیں تقسیم ہوتی ہیں ختم نہیں ہوتیں بڑے صاحب، ارباب صبح جاتے ہوئے ظفریاب سے کہہ گئے تھے کہ آج وہ جلدی آنے کی پوری کوشش کریں گے۔“

”ہنا نہیں۔“ جہاں زیب بیگ نے چائے کا کپ اٹھایا۔

”ایسا وعدہ تو کئی دنوں سے کر رہا ہے وہ۔“ انہیں یقین نہیں تھا لیکن وہ شاہ رخ کو سارا کام سمجھا کر عصر سے کچھ پہلے ہی آگئے تھے۔ اور عصر کی نماز کے بعد سے ہی سب ہی دادا جان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ زل اور ثنا کا ریٹ پر فلور کشن پر بیٹھی تھیں جو ثنا ڈرائنگ روم سے اٹھالائی تھی۔ ظفریاب جہاں زیب بیگ کے پاس ہی ان کے بیڈ پر بیٹھے تھے۔ آ زین، مرتضیٰ اور ارباب کرسیوں پر تھے۔ درمیانی ٹیبل پر کچھ دیر پہلے ہی بی بی اماں نے دوسری بار آ کر چائے رکھی تھی۔ ارباب اپنی اور ظفریاب کی مشترکہ شرارتوں کے قصے سن رہے تھے۔ زل نے پہلی بار ارباب تایا کو یوں ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔

”یہ ظفر تو شروع دن سے ہی انقلابی تھا نئی نئی باتیں سوچتی تھیں اسے۔“

انہوں نے محبت سے ظفر کی طرف دیکھا۔ ”جب میں فرسٹ ایئر میں تھا اور یہ میٹرک میں تو ایک بار اس نے تھل کے لیے فلم کا آخری شو دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اماں جان کو اس نے اپنی سازش میں شامل کر لیا تھا کہ سونے سے پہلے وہ ٹخن اور ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی اندر سے کھول دیں گی۔ اب اماں جان کو بھی اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ بارہ بجے کے بعد واپسی ہوگی کہ آخری شو نو بجے سے بارہ تک تھا اور ابا جان کا حکم تھا کہ مغرب کے بعد کوئی گھر سے باہر نہیں رہے گا۔“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)